نئی نسل کا معمار اور تعمیر و ترقی کا داعی

ماہنامہ

رفیقِ منزل

جلد: ۳۱ | شمارہ: ۱ | جنوری ۲۰۱۸ء | ربیع الآخر۔جمادی الاول ۱۴۳۹ھ

editor@rafeeqemanzil.com

MANAGER
Bilal Khan 9029194433
managerrmgp@sio-india.org

Asst. MANAGER
Abdul Jabbar 08447622919
asst.managerrmgp@sio-india.org

₹15 | سالانہ ₹160

D-300, Abul Fazl Enclave Jamia Nagar, Okhla New Delhi - 110025 | Tel: 26949817 | Email:managerrmgp@sio-india.org | www.rafeeqemanzil.com

Printed on behalf of The Students Islamic O rganisation ofIndia, Printer & Publisher Tanveer Alam, Printed at Bharat Offset, 2034/35, Qasim Jan Street, Ballimaran, Delhi - 110006, Published from 230, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025 | **Editor : Abul Aala Sayyed**

بعد والے

ڈاکٹر وقار انور

عن ابی ذر قال: قال رسول اللہ ﷺ اشد امتی لی حبا قوم یکونون او یخرجون بعدی یود احدھم انه اعطی اھله و ماله و انه رائی (السلسلۃ الصحیحہ حدیث نمبر 3362)۔

ابوذر رضی اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: میری امت میں مجھ سے شدید ترین محبت کرنے والے ایسے ہوں گے جو میرے بعد آئیں گے۔ ان میں سے ہر شخص چاہے گا کہ وہ اپنا گھر بار اور مال دے دے اور مجھے دیکھ لے۔

دیگر متعدد احادیث میں قابل قدر بعد والوں کا تذکرہ پسندیدہ انداز میں آں حضرتؐ نے کیا ہے حتیٰ کہ چند احادیث میں آپؐ نے ان ''بعد والوں'' کی تعریف کرتے ہوئے یہاں تک وضاحت کر دی ہے کہ وہ آپؐ کے اصحاب کرام سے زیادہ اچھے ہوں گے۔ ہم اس بات کو اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ قیامت تک جو ادوار آتے رہیں گے اس میں ایسے افراد امت مسلمہ میں رہیں گے جو قابل قدر ہوں گے، البتہ اجتماعی طور پر صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین سے بہتر افراد کا دور نہیں آسکے گا۔ شرف صحابیت کی اہمیت برقرار ہے اور رہے گی۔ بعد والے صحابہ کرام سے محبت اور رشک کرتے رہیں گے کہ انہوں نے ایمان کی حالت میں سیدنا محمد الرسول اللہؐ کا دیدار کیا اور اتباع رسول کر کے اس شرف کا حق ادا کر دیا۔

آں حضرت کا دیدار بنفس نفیس نہیں کر سکنے کی حسرت بعد کے تمام ادوار کے مومنین صالحین کو رہی ہے اور رہے گی اور اس کی قدر و قیمت ان لوگوں کے سامنے اتنی زیادہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں اہل و عیال اور مال و متاع کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

یہ حدیث اور اس نوع کی دیگر احادیث ایک طرف ایک صورت واقعہ کو بیان کرتی ہیں کہ امت مسلمہ میں حضورؐ کے بعد کے زمانے میں بھی ایمان و عمل کے لحاظ سے بلند پایہ افراد موجود رہیں گے۔ اور تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہر صدی میں مجددین اور ہر زمانہ میں اونچے درجہ کے عباد الرحمن موجود رہے ہیں اور ان شاء اللہ یہ امت قیامت تک ایسے رجال سے خالی نہیں ہوگی۔ دوسری طرف ایسی احادیث ترغیب دلاتی ہیں کہ دور نبوی نہیں پانے کے باوجود اس پاک دور کی سعادتوں میں اپنا حصہ پانے کی سعی کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی رحمتوں کا دروازہ کھلا رکھا ہے بشرطیکہ کسی فرد کو اس کی توفیق حاصل ہو جائے اور وہ رسول اللہؐ کی شدید محبت کو اختیار کرے اور اس کے تقاضے کو پورا کرے۔

درج بالا حدیث میں محبت رسول کے تقاضے کو خوبصورت پیرائے میں بیان کر دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اس کے مقابلہ میں انسان اپنا گھر بار اور مال (اھلہ و مالہ) بھی قربان کرنے میں جھجک نہ محسوس کرے اور یہی دعویٰ محبت کا اصل ثبوت ہے۔ یہ دعویٰ زبان سے نکلنے والے الفاظ کے ادا کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس راہ میں سب کچھ لٹا کر بھی مسرور و مطمئن ہونے کا نام ہے۔

حضورؐ کا ایمان اور محبت کے ساتھ دیدار ہو جانے کی جس سعادت کا اس حدیث میں ذکر ہے اس کا تعلق ماضی سے نہیں ہے کیوں کہ گردش ایام پیچھے کی طرف لوٹ نہیں سکتا ہے۔ اس کا تعلق حال اور مستقبل سے ہے۔ احادیث میں خواب میں دیدار 'قبر میں دیدار' میدان حشر میں شفاعت، حوض کوثر پر ملاقات اور جنت میں حضورؐ سے قربت نصیب ہونے کا ذکر واضح طور پر موجود ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہر بندہ مومن کے قلب میں ان تمام نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کی تمنا موجود ہوتی ہے۔ درج بالا حدیث اسی بات کی ترغیب دلاتی ہے اور امید جگاتی ہے کہ حضورؐ کی اتنی شدید محبت کو اپنے قلب میں جگہ دی جائے کہ دنیا میں موجود تمام نعمتیں چاہے وہ گھر بار ہو یا مال و متاع وہ سب حقیر لگنے لگیں اور محبت کی راہ اگر تقاضہ کرے تو ان کو قربان کر دینا سہل ہو جائے۔ محبت قربانی کا تقاضہ کرتی ہے۔

طلبائی یونین: تحفظ جمہوریت یا دین کی دعوت؟؟

اکثر لوگوں کو اس سوال پر تعجب ہوگا۔ یہ تعجب اصل میں ان دو کاموں میں سے کسی ایک کو چننے کا مطالبہ کرنے کی وجہ سے ہوگا۔ یہ دو کام بالعموم ایک دوسرے کے معاون اور کئی جگہ ایک دوسرے کے متبادل کی حیثیت سے بھی تسلیم کئے جاتے ہیں۔لیکن اس سوال کی رُو سے اسے باہم متضاد کاموں کی حیثیت دی گئی ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے درج ذیل نکات پر توجہ درکار ہے۔

اسٹوڈنٹس یونین کے لئے مسلم طلباء کو حرکت میں لانے کی تیاری بہت پہلے سے جاری ہے۔لیکن اس تیاری سے پہلے کوئی ایسا نقشہ تیار نہیں کیا گیا جس سے اس بہت اہم سوال کے منطقی اور ٹھوس جوابات سامنے آسکیں۔جس سے اس بات کا اندازہ ہوسکے کہ یہ جدوجہد اسلام اور مسلم طلباء کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگی یا نقصاندہ۔اس شمارے میں ہم نے کئی اداروں کی طلباء یونین کی صورتحال کا ایک تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ صورتحال کس قسم کی پیش رفت کا تقاضاء کرتی ہے اس پر غور وفکر کرنا بے حد ضروری ہے۔اور جب ہم طلباء یونین کی بحالی اور مؤثر کارگذاری کی بات کہتے ہیں تو ہمارے پیش نظر کیا معیارات ہونے چاہئیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے۔اسی کے ساتھ سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا اس جدوجہد کے ذریعے اسلام کی سربلندی کی راہیں ہموار ہوسکتی ہیں؟ یا نقار خانے کی طوطی کے مترادف چیخ پکار میں ہماری توانائی صرف ہوجائے، اس بات کے امکانات کس درجہ موجود ہیں؟

باطل کی کامیابی یہ ہے کہ اس نے بڑی آسانی سے مسلمانوں کے منہ میں ایک ایسی زبان اور طرزِ زبان ڈال دی ہے جس سے اسلام کی بات بھی اسلام کی نہ رہے۔مثلاً کسی بھی مذہب کو اختیار کرنے کی شخصی آزادی، جس کا علم بردار اسلام ہے، اسے سیکولرزم کا نام دے دیا گیا ہے۔ حالانکہ اسلام کا مؤقف اور سیکولرزم ایک دوسرے سے بالکل مختلف تصورات ہیں۔لیکن کتنی عیاری سے باطل نے مسلمانوں کو سیکولرزم کا علم بردار بنادیا۔اور مسلمانوں نے 'غیر باغٍ ولا عادٍ' کے فلسفہ کے تحت اسے چپ چاپ قبول کرلیا۔اب جب بھی مسلمان سیکولرزم کی بات کرتے ہیں تو اسلام کے فراخ دلانہ اور منطقی مؤقف کی جگہ ختم ہوکر رہ جاتی ہے۔اسی طرح جمہوریت کی بھی مثال ہے۔ اس لئے یہ اصولی طور پر بہتر ہے کہ سیکولرزم کو رد کرکے ہم صاف ستھرے اور مہذب طریقے سے براہ راست اسلام کے مؤقف کی ترجمانی کریں۔اور باطل کے ان کمزور تصورات کی بیخ کنی کرتے چلے جائیں۔غیر باغٍ ولا عادٍ کا فلسفہ اجتماعی زندگی میں چسپاں کرنا مناسب نہیں ہے۔

اسی طرح دعوتِ دین ایک پروقار کام ہے۔ کسی نبی نے، کسی صحابی نے، دعوت دین کا فریضہ حکومت یا اقتدار کے حصول کے لئے نہیں ادا کیا۔قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ دعوت اپنے مفاد کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے مفادات کا حقیقی تحفظ (بمعنی دیگر آخرت کی کامیابی) کے لئے دی جاتی ہے۔اس بناء پر یہ دعوتی اصول ہم ترتیب دے سکتے ہیں کہ وہ عمل کوئی درست عمل نہیں ہے، جس سے داعی کے وقار کو ٹھیس پہنچے اور مدعو کے لئے مشکل ہوجائے کہ وہ اسلام کی دعوت میں اور اقتدار کی جدوجہد میں فرق نہ کرپائے۔

طلبائی یونین عصر حاضر کے ان ذرائع کا نام ہے جس کے ذریعے طلباء کو علمی بہتری، فکری پختگی، کردار کی مضبوطی، شجاعت، قیادت، آزادئ اظہار رائے، جرح وتنقید وغیرہ کی تربیت ملنے کا امکان ہے۔اور اسی مقصد کے تحت اسے تشکیل دیا جانا چاہئے۔لیکن اپنے آس پاس نظر دوڑانے سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ اوپر درج الفاظ کا عملی رویہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کام بالعموم کمتر معیار کے طلباء کے ذریعے سے انجام پاتا ہے۔ یہ لوگ نہ صرف فکری بلکہ اخلاقی بے راہ روی کے شکار ہوتے ہیں۔اس پورے نظام میں ہر سطح کے لوگ سیاسی قیادت کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ یہ اپنے تصورات، آزادی کے بجائے تعصب کی بناء پر ترتیب دیتے ہیں۔ ہر جگہ بڑی سیاسی جماعتیں اپنے طلبائی شاخوں کے ذریعے اقتدار کے حصول کے راستے تلاش کرتی ہیں۔ کچھ طلباء ایسے بھی ہیں جو اپنی تمام صلاحیتوں کا استعمال صرف اور صرف تنقید اور تنقیص میں گذار دیتے ہیں۔اور کوئی بھی تعمیری نقشہ سماج اور دیگر طلباء کے سامنے پیش کرنے سے معذور ہوتے ہیں۔اسی طرح کسی بھی طلباء یونین کو آپ تعلیمی معیار کی بلندی کے لئے، اخلاقی ارتقاء کے لئے، سماج کی خدمت کے لئے، نظم وضبط کی تربیت کے لئے، شخصیت کے مجموعی ارتقاء کے لئے کوئی جدوجہد کرتے ہوئے نہیں دیکھیں گے۔ خاص بات یہ ہے کہ ان تمام کاموں کے علاوہ سارے کام وہ انتخابات کے بعد بھی اور انتخابات سے پہلے بھی بدستور انجام دیتے رہتے ہیں۔اس طرح انتخاب ان کے نزدیک صرف ایک ثقافتی پروگرام کی حیثیت رکھتا ہے۔جس میں وہ خود کی بڑائی اور دوسروں کی کمتری کا ہر ممکن طریقے سے پرچار کرتے ہیں۔

اس صورتحال میں طلبائی یونین کی بحالی کے سلسلے میں اور پھر بالخصوص مسلم طلباء کا سیاسی جدوجہد میں حصہ دار بننے میں کئی خرابیوں کو تحریک ملنے کے امکانات ہیں۔اوّل، اس جدوجہد کے نتیجہ میں نفرت اور منفی مسابقت کو جلا ملتی ہے۔قوم پرستانہ جذبات بیدار ہوتے ہیں۔اور تعصب کی چتا، غور وفکر کے ماحول کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ دوّم، اس پوری جدوجہد کے آدابِ بزم متعین ہیں۔الفاظ اور نعرے متعین ہیں۔اس جدوجہد میں اسی قسم کی باتیں کرنا اسلام کی امتیازی دعوت کو لوگوں کے سامنے آنے سے روک دیتا ہے۔سوّم، اس جدوجہد میں داعی کا وقار مجروح ہوتا ہے۔سیاسی داؤ پیچ کے درمیان داعی خود کو سارے سماج، دلت و برہمن، کانگریس اور بی جے پی دونوں کو بیک وقت مخاطب کرنے اور اسلام کی جانب بے لاگ دعوت دینے سے معذور پاتا ہے۔نتیجتاً اسے عام لوگوں کی طرح ایک طبقہ کو ذلیل کرنا پڑتا ہے اور دوسرے کی دوستی کی خاطر دین کی تعلیمات سے مداہنت کرنی پڑتی ہے۔ چہارم، طلباء وطالبات کو دین کی سربلندی کی خاطر نظام ہائے وقت سے اِبا کرنے کی تربیت دینے کے بجائے اس سے ساتھ موافقت کرنے کی تربیت ملتی ہے۔ایک معذور ذہنیت کی ساتھ، بکھری ہوئی، منتشر شخصیت لئے ایک مسلم طالب علم ظاہر ہے اسلام کے کسی کام کا نہیں ہے۔

خاص بات یہ ہے کہ طلباء یونین سے جتنے کام کرنے مقصود ہیں وہ تمام کام اس کے بغیر بھی کئے جاسکتے ہیں۔ بلکہ سیاست سے دور ذہین طلباء کے اجتماعی کاموں میں تعلیمی برکت اور سماج کا تعاون ملنے کے زیادہ امکانات ہیں۔اس سلسلے میں درست اسلوب کو اختیار کرنے سے نہ صرف اسلام کی دعوت کو وسیع پیمانے پر اور تعصّبات کے زہر سے پاک کرکے لوگوں کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے۔ہمیں مسلمانوں کے درمیان جھنڈے لہرانے والوں کی اب ضرورت نہیں ہے۔ایسے طلباء کی ضرورت ہے جو کہ پورے اطمینان سے لوگوں کی سمجھ میں آنے والی 'اسلام کی زبان' میں بات کرنے کی صلاحیت اور تربیت رکھتے ہوں۔یہی وہ محاذ ہے جہاں ایس آئی او کی ضرورت پیش آتی ہے۔۔۔

ادب کا تعمیری و کلی نقطۂ نظر

پروفیسر احمد سجاد

پچھلی تین صدیوں میں مغرب نے اپنی مادی وعسکری ترقی اور معاشی وسیاسی برتری کی بدولت جہاں دنیا کو بہت کچھ دیا وہیں اس کی بہت سی بیش قیمت متاع کو چھین بھی لیا۔ جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ آج دنیا کا جو ملک جتنا زیادہ ''ترقی یافتہ'' ہے اتنا ہی زیادہ ظلم وجبر، استحصال اور قتل وغارتگری کا سبب بھی ہے۔ مغربی فکر ونظر کا بنیادی نقص مادہ پرستی کے نتیجے میں اس کی جزو پرستی ہے۔ پچھلی دو صدیوں میں ان ''شکستہ بتوں'' کے عجائب خانہ میں اگر جھانکیں تو ہمیں ڈارون کی ارتقائیت، میکیاویلی کی وطنیت، کارل مارکس کی اشتراکیت، فرائیڈ کی جنسیت، ایڈلر کی لاشعوریت، ینگ کی اساطیریت اور ژاں پال سارترے کی وجودیت وغیرہ کی لاشوں کے ڈھیر نظر آئیں گے۔

ے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے

انہیں دو تین صدیوں میں مغرب نے اپنی عسکری قوت، تکنیکی ترقی، معاشی خوشحالی اور سیاسی پروپیگنڈے کے ذریعہ مشرق بلکہ تقریباً پوری دنیا کو اپنا یرغمال اور غلام بنالیا، اس لیے مشرق کے بعض ادیب ودانشور بھی ان سے مرعوب ومتاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ چنانچہ مشرقی ادبیات بشمول اردو میں بھی جزو پرستانہ ادبی نظریات کی ایک وبا چل پڑی مثلاً ادب برائے ادبیت، ترقی پسندیت، جدیدیت، لسانیت، تکثیریت اور اب تازہ ترین نجاتیت (بنام: آزادی، خودمختاری وکشادگی) ان میں آخر الذکر کو بساغنیمت کہا جاسکتا ہے کہ اس میں حق تک پہنچ کے حصول نجات کی جستجو پائی جاتی ہے۔

ے
تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحر قدیم
گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم

اس صورت حال نے زندگی وادب کے تعمیری یا کلی نقطۂ نظر کو وقتی طور پر بڑا نقصان پہنچایا۔ انسانی تاریخ از آدم تا ایندم گواہ ہے کہ اس نے اس کرۂ ارضی پر جب اولین قدم رکھا تو اس وقت سے آج تک جبلت کے علاوہ وہ خودشعوری اور خدا پرستانہ کلی قدری شعور سے مالا مال رہا ہے۔ مگر اس جزو پرستانہ ہائے ہونے پوری انسانیت کو ''معلومات زدہ جہل مرکب'' میں مبتلا کردیا۔ چنانچہ ایک طرف بچیاں ماں کی کوکھ میں ماری جارہی ہیں تو دوسری طرف عورتوں کی کوکھ کو کرایہ پر لے کر بے اولادی کا غم غلط کیا جارہا ہے۔ انسانی اعضا کی چوری کے لیے اغوا کا ایک نیا ریکٹ شروع ہوگیا ہے۔ عورت، عورت سے اور مرد، مرد سے شادی رچا رہے ہیں۔ اس فکر ونظر کا فساد یہ بھی ہے کہ آج ساری دنیا میں تین بنیادی رشتوں کا بحران پیدا ہوگیا ہے یعنی: انسان اور خدا، انسان اور فطرت، انسان اور انسان کے مابین۔ ان تین بنیادی رشتوں کے بحران نے مزید تین انسانی رشتوں کے توازن کو بگاڑ کے رکھ دیا ہے یعنی: مرد کا مرد سے، مرد کا عورت سے اور فرد کا اپنی ذات سے۔

ے
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

زندگی کے اس کلی یا روحانی تعبیر کو پس پشت ڈالنے کی وجہ سے انسانی واخلاقی ہی نہیں کائناتی بحران بھی پیدا ہوگیا ہے۔ گلوبل وارمنگ، اوزون کا سوراخ، کاربن ڈائی آکسائیڈ زہر کی فراوانی، فضا کی آلودگی اور صاف پانی کی شدید قلت وغیرہ آخر کیا ہیں؟ حیات وکائنات کے اس بحران پر متعدد مغربی دانشوروں اور تخلیق کاروں نے تشویش کا اظہار کیا ہے۔ ٹی، ایس، ایلیٹ نے اسے ''ہوش مندی کے انقطاع'' اور روزموں نے اسے ''وحشت وبربریت کی کامیابی'' پر محمول کیا ہے۔

ے
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیران خرابات

اس کے برعکس کلی وتعمیری فکر ونظر نے ''فی السلم کافۃ'' کی وجہ سے جملہ شیطانی وساوس وغلبے سے انفرادی وسماجی دونوں سطحوں پر محفوظ ومامون رہنے کا نسخۂ شفا پیش کیا ہے اور کارحیات کو چند سالہ جہان فانی تک محدود رکھنے کے بجائے حقائق ابدی تک دراز کردیا ہے۔ یہاں آزادی کا مطلب مادر پدر آزاد ہونا نہیں ہے بلکہ ہر طرح کے 'فتنوں' سے خود کو بچاتے ہوئے تسخیر کائنات تک کی راہ ہموار کرنی ہے۔ کیونکہ بعض فتنے قتل سے بھی بدتر ہیں جن سے آج حیات انسانی نت نئے بحرانوں کا شکار ہے۔ اسی لیے راہ حق کو یہاں نور وظلمت، معروف و منکر، گناہ وثواب، تقویٰ وفجور، کلمہ طیبہ وکلمہ خبیثہ وغیرہ کے تضادات سے واضح کرکے ایک مکمل نظام حیات کو پیش کیا گیا ہے۔ جہاں مسخ شدہ مذاہب کی تنگی اور خوش کن بشارتوں اور ہیبت ناک اذیتوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ آغاز ہی میں واضح کردیا گیا ہے کہ ''لکم دینکم ولی دین، لا اکراہ فی الدین اور لست علیھم بمصیطر'' کے ساتھ ''امر بالمعروف و نھی عن المنکر'' ضروری ہے۔ اس لیے یہاں ہر نئے احساس، جدید فکر، نادر تجربے اور نئے امکانات کے تخلیقی اظہار کی مصنوعی نہیں حقیقی آزادی میسر ہے۔

ے
بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم وطرح دیگر اندازیم
اور
میں کہاں رکتا ہوں عرش وفرش کی آواز سے

ے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حد پرواز سے

ماہنامہ رفیق منزل ماہ نومبر 2017 کا شمارہ پڑھنے کو ملا پڑھنے کے بعد جو احساسات دل میں پیدا ہوئے قبل اس کے کہ انہیں آپ تک منتقل کروں، ذمہ داران رفیق منزل کو صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ ایسے حالات میں جبکہ ملت کے بہت سے رسالے اور میگزین دھیرے دھیرے بند ہورہے ہیں، رفیق منزل مسلسل ترقی کی طرف گامزن ہے اور طلبہ برادری کے ذہنی اور اخلاقی معیار کو بلند کرنے میں کوشاں ہے۔ رفیق منزل مختلف نوعیت سے سابقہ رسالوں کے مقابلے میں اب بہت ممتاز اور معیاری معلوم ہوتا ہے۔ اولاً رسالہ کے اوراق بہت جاذب نظر اور خوبصورت ہوئے ہیں جو کہ دیگر پروفیشنل میگزین سے کم نہیں ہے۔

ثانیاً اس شمارہ میں "تعصب اور عصبیت" کے متعلق مضامین کا غلبہ رہا ہے جو ایک اچھی سوچ ہے اور قارئین کے ذہن کو اس جانب سوچنے اور غور وفکر کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

ان مضامین میں سے راقم کو جو مضمون پسند وہ سعود فیروز صاحب کا لکھا ہوا "لبرل ازم اور کمیونٹیر یزنم" ہے جس میں انہوں نے ان دونوں نظریات کا مختصر اور جامع تعارف پیش کیا ہے اور اس تعلق سے مزید پڑھنے کی جستجو پیدا ہوگئی۔ مجموعی لحاظ سے رفیق منزل طلبہ کی اچھی رہنمائی کررہا ہے۔

ناچیز مدیر محترم سے گزارش کرتا ہے کہ ہر شمارہ میں جدید افکار کے حوالے سے ایک مضمون مختص کریں مثلاً جدیدیت اور مابعد جدیدیت، ساختیات اور پس ساختیات وغیرہ اور اگر ساتھ ہی ان کے پیدا کردہ چیلنجز کا اسلامی نقطہ نظر آجائے تو سونے پے سہاگہ۔

امتیاز احمد۔ اے ایم یو علی گڑھ

یہ کہا جاتا ہے کہ نوجوان ہی کسی قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں، جہد مسلسل اور جفاکشی ان کا امتیاز ہوتا ہے، بے پناہ صلاحیتیں ان میں پوشیدہ ہوتی ہیں، بلند پرواز ان کا ہدف ہوتا ہے، چیلنجز کا مقابلہ کرنا ان کا مشغلہ ہوتا ہے، شاہینی صفات سے وہ متصف ہوتے ہیں، ایک بڑے ہدف کو حاصل کرنے کے لیے وہ بہ آسانی ساحل پہ کشتیاں جلانے کو تیار اور ہواؤں کا رُخ موڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

لیکن یہ طبقہ اسی وقت قوم وملت کے لئے کارگر ثابت ہوسکتا ہے جب اس پر خصوصی توجہ مرکوز کی جائے۔ نوجوانوں کی اسلامی خطوط پر رہنمائی کرنا نہ صرف دور حاضر کا بلکہ ہر دور میں تجدیدی نوعیت کا کام ہوتا ہے۔ موجودہ حالات میں نوجوانوں کے درمیان مقصد زندگی سے ناآشنائی ہے ان کا طرز زندگی تیزی سے تبدیل ہورہا ہے، ان کے اندر فکری، تعمیری اور تخلیقی سوچ کا پروان نہ چڑھنا بہت بڑا المیہ ہے۔ ایسے حالات میں رفیق منزل کے ماہ دسمبر کا شمارہ دیکھ کر خوشی ہوئی اور اس کے مرکزی موضوع "مسلم نوجوان کی طرز زندگی" کو تفصیل سے پڑھنے کی خواہش پیدا ہوئی، فہرست پر نظر ڈالی تو بے حد خوشی ہوئی کہ مرکزی موضوع کے تحت مختلف مضامین کو طلبہ و نوجوانوں کے لئے بہت ہی سلیقے سے یکجا کیا گیا ہے شمارے میں مرکزی موضوع کے تحت بہترین تجزیاتی مضمون شامل کیے گئے جس سے یقیناً قارئین کو فائدہ ہوگا۔

رفیق منزل کو دیکھ کر محسوس ہوا کہ اس کا معیار پہلے کے بالمقابل کافی بلند ہوا ہے شمارے میں جہاں عمدہ مرکزی موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے وہیں مختلف النوع مضامین کے لیے کالم بھی مختص کئے گئے ہیں۔ چونکہ انسان کا کوئی کام نقص سے پاک نہیں ہوتا اس لئے شمارے میں پروف ریڈنگ کی کافی کمی محسوس ہوئی امید ہے آئندہ اس کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ امت کے نوجوانوں کو زندگی کا مقصد اور دین کا صحیح فہم عطا فرمائے۔ آمین

عفان معین خان۔ الجامعہ الاسلامیہ، کیرلہ

موجودہ حالات میں علم کے حصول کے لئے محنت کرنا ایک عجیب بات ہوگئی ہے۔ آج سے دس بیس سال قبل کی بات لے لیجئے جہاں علم حاصل کرنے کے ذرائع اتنے نہ تھے جتنے آج موجود ہیں۔ چونکہ یہ دور سوشل میڈیا کا دور ہے جہاں ہم علم اپنے جیبوں میں لیے گھوم رہے ہیں، جہاں علم اور خبریں ہم ٹکڑوں میں پڑھنے کے عادی ہوچکے ہیں، ہمارے گھروں کے دروازوں پر میگزین و کتابیں دستیاب کی جارہی ہیں یقیناً یہ فائدہ مند ہیں۔ لیکن علم کا بہتر حصول کتابوں کے سوا کسی اور ذریعہ سے فائدہ مند نہیں۔

الحمدللہ ماہ دسمبر کا رفیق منزل فکری اور علمی اعتبار سے فائدہ مند رہا جہاں مختلف عناوین کے ذریعہ علم میں اضافہ ہوا، جن میں کئی تو نوجوانوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوں گے اور کئی عناوین نوجوانوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس دلائیں گے، اس کی امید کرنا غلط نا ہوگا۔ مختلف عنوان جو نوجوانوں کو راہ دکھائیں گے، جہاں وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا، ہمارے اسلاف کی قربانیوں اور خدمات کی مثالیں پیش کرتے ہوئے ہمارے مقصد کو واضح کرتا ہے اور یاد دہانی کراتا ہے کہ ہم اس قوم کے فرد ہیں جو دنیا کو دنیاوی اور اخروی دونوں میں کچھ دینے کی قابلیت رکھتے ہیں اور ان کی ہر طرح سے اصلاح کرتے ہیں۔ تو دوسری طرف نوجوانوں کی طرز زندگی خدشات اور امکانات میں یہ بات نکل کر آتی ہے نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی خواہشات کے خاطر کوئی بھی غلط کام کرنے کے لئے تیار ہے۔ وہ کسی بھی حد کو پار کرنے کیلئے تیار ہے جس کی وجہ سے نوجوانوں میں اخلاقی گراوٹ بڑھتی جارہی ہے۔ اگر مسلم نوجوان اپنی نفسانی خواہشات پر قابو کرنے پر خود کو تیار کرلیتا ہے تو یقیناً تاریخ اُن نوجوانوں کی خود گواہی دے گی۔ ایسے موقع پر ان عنوانات پر توجہ دینا بہت ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مومن زمانہ شناس ہوتا ہے وہ ماضی حال اور مستقبل پر گہرا فہم رکھتا ہے اس کو دیکھ کر آنے والے حالات کو بہتر بنانے میں مثبت پہلو ادا کرتا ہے۔ ایسے حالات میں ایک نوجوان کو اپنی صحت کا خیال رکھنا لازم ہے ایک نوجوان کا تصور اسکی ساخت، قوت اور جذبہ سے پہچانی جاتی ہے اکثر دیکھنے کو مل رہا ہے نوجوان جز وقتی تسکین کی خاطر اپنے جسمانی قوت کو نقصان پہچا رہے ہیں ساتھ ہی ساتھ روحانی پاکیزگی کو بھی برباد کررہا ہے جس کی وجہ سے فکری صلاحیت اور جسمانی طاقت پر اس کا گہرا اثر پڑ رہا ہے اور اخلاقی خرابیاں پروان چڑھ رہی ہیں۔ ایسے حالات جہاں پر ملک ایک طرفہ ذہنیت کا موڑ لے رہا ہے، جہاں پر لو جہاد گھر واپسی اور گائے کے نام پر ظلم ڈھائے جارہے ہیں ملک کو ایک ذہنیت کی طرف کھینچا جارہا ہے ایسے حالات میں ایک مسلم نوجوان کی ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں ایسے حالات میں ایک مسلم نوجوانوں کے گروہ کا اسلام ایک نظام حیات، جیسے نعروں کی صدا لگائے تبدیلی کے طرف بڑھنا ہی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ایسے حالات میں ایک مسلم نوجوان کا تیار ہونا اور افراد سازی کرنا ہی سب سے اہم ضرورت ہے۔

سلیمان خان۔ نظام آباد

بی۔ایچ۔یو

اساتذہ کی خاموشی، خوف کے ماحول وجمہوری عدم موجودگی کا شاخسانہ

شریا چودھری

ستمبر ۲۰۱۷ کے ایک جمعہ کو 52 گھنٹوں کے احتجاج، جو کہ طالبات نے بنارس ہندو یونیورسٹی میں ساتھی طلبا کے چھیڑ چھاڑ کے خلاف کیا تو پچھلے سال حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی میں ہوئے طلباء تحریکوں سے موازنہ کا موقع فراہم کر دیا۔ فروری 2016 میں کنہیا کمار، عمر خالد اور دوسرے طلباء جب گرفتار کئے گئے تو اساتذہ ایسوسی ایشن کا کردار قابل ذکر تھا۔ وہ طلباء کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ اسی سال دہلی یونیورسٹی کے رام جس کالج میں طلباء کے ساتھ اساتذہ نے بھی عمر خالد کو سیمینار میں شرکت سے روکے جانے کے خلاف مارچ کیا اس سے قبل دلت اسکالر روہت ویمولا کی موت کے بعد جنوری 2016 میں طلباء کے ساتھ ساتھ چند اساتذہ بھی حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی میں احتجاجی تھے اور گرفتار کر لئے گئے۔ اے بی وی پی طلباء کے ایماء پر روہت ویمولا کے ساتھ ہوئی ناانصافیوں کے چلتے دلت اسکالر نے اپنی جان دے دی تھی اور موت سے قبل اپنے ساتھ ہو رہے بدسلوکی کے خلاف وہ آواز اٹھاتا رہا۔ اس کے برخلاف بنارس ہندو یونیورسٹی کے اساتذہ خاموش دکھائی دیے۔ جب کہ احتجاجی طلباء پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا تھا۔ جس کی مختلف گوشوں نے مذمت کی تھی۔

ہندی ڈپارٹمنٹ کی ایک ریسرچ اسکالر پریتی کماری نے تہِ دل سے دو موظف ہندی پروفیسر جنہوں نے میڈیا سے گفتگو کی، کا شکریہ ادا کیا کہ کوئی ہمارے لئے بولنے والا نہ تھا پر نہ جانے وہ واحد ٹیچر تھی جنھوں نے Scroll.in کو اپنے نام کے ساتھ اپنی بات کو چھاپنے کی اجازت دی اور مزید یہ کہا کہ باقی اساتذہ پابندی والے قوانین، یونین کی غیر موجودگی اور مکمل اختیارات اپنے ہی پاس رکھنے والی انتظامیہ کو اپنی خاموشی کی وجہ بتا رہے ہیں۔ انہیں اپنے خلاف تادیبی کاروائیوں جیسے ترقی کے رکنے کا خدشہ لگا ہوا ہے۔ جس کی بنا پر اساتذہ ان احتجاجوں سے اپنے آپ کو دور رکھ رہے ہیں۔ جبکہ طلباء کا خیال ہے کہ اساتذہ نے 2015 میں بی سی ترپاٹھی کے چارج لینے سے قبل ہی ان کے حق میں آواز اٹھانی چھوڑ دی ہے۔

طلباء یونین کی عدم موجودگی:

1997 میں انتخاب کے بعد ہوئے تشدد اور دو طلبا کی موت کے بعد سے ہی یونیورسٹی میں کوئی یونین نہیں بنی ہے۔ اس سے قبل ہی 2002 سے ہی بنارس ہندو یونیورسٹی ٹیچر ایسوسی ایشن بھی بند ہو گئی تھی۔ چھ سال پہلے اس کو دوبارہ شروع کرنے کی کوشش رائگاں گئی۔ یونیورسٹی کی ٹیچرس ایسوسی ایشن کے مطابق پچھلے وائس چانسلر ڈی۔ پی۔ سنگھ نے اس ایسوسی ایشن کی سرپرستی سے انکار کر دیا تھا۔ مزید یہ کہ یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل اور اگزیکیوٹو کونسل میں ٹیچرس کے تقررات کیے جاتے ہیں نہ کہ انتخابات جو کہ یونیورسٹی کے تمام اہم بڑے معاملات طے کرتی ہے ان سب باتوں نے زیادہ تر اساتذہ میں یہ تاثر پیدا کر دیا ہے کہ ان پر بھی سول سروسز جیسے قوانین نافذ عمل ہے لہٰذا انہیں کسی معاملے میں یکجا ہونے اور اقدامات اٹھانے کی اجازت نہیں۔

فلسفہ اور مذہب شعبہ سے تعلق رکھنے والے ٹیچر نے بتایا کہ ہمیں پریس کانفرنس کرنے، حکومت پر تنقید کرنے یا یونیورسٹی انتظامیہ پر یا وی۔سی پر تنقید کرنے کی اجازت نہیں۔ پانڈے نے مزید بتایا کہ نئے اساتذہ سے یونیورسٹی میں ایک انڈرٹیکنگ لی جارہی ہے۔ تاکہ ایسے معاملات میں وہ لب کشائی نہ کر پائیں ورنہ ان کے خلاف کاروائی کی جاسکتی ہے۔

بی۔ یچ۔ یو۔ کے اقدار:

ہرن جاپے نے یہ اعتراف کیا کہ انتظامیہ کسی شدید کاروائی کے بجائے ناقدین کے لئے دوسرے مسائل کھڑے کرتی تھی۔ خود ان کے پروموشن کو روک دیا گیا تھا۔ ساتھ ہی انتظامیہ سے سیمناروں کے لئے جگہ کی منظوری یا گرانڈس کو روک دینے جیسے تادیبی امور انجام دیتے ہیں۔ انہوں نے مزید یونیورسٹی کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے خواتین کے ساتھ مساویانہ سلوک روا، نہ رکھنے اور ان کی عدم نمائندگی کا بھی الزام لگایا۔ فلسفہ کی ٹیچر کے مطابق ان کے شعبہ میں صرف 19 خواتین اساتذہ ہیں۔ شعبہ تاریخ کے ایک ٹیچر کے مطابق صرف 20% ہی خواتین ہیں پولیٹکل سائنس کے ٹیچر جنہیں فیمنسٹ کہا جاتا ہے بتاتے ہیں کہ منواسمرتی ہندوستان کے آئین سے بھی بالاتر ہے۔ فلسفہ کے ٹیچر کے مطابق سماج کو پسماندہ اور کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے اساتذہ یونیورسٹی کے ماحول میں گھٹن محسوس کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ یونیورسٹی پر اونچی ذات کے لوگوں کا دبدبہ ہے اور زیادہ تر افراد یہاں زن بیزار جاتیوادی اور مسلمانوں کے مخالف ہیں۔

پسماندہ طبقات کو دیئے جانے والے تحفظات پر بھی اونچی ذات کے اساتذہ کھلے عام ناراضگی ظاہر کرتے ہیں ان طبقات سے تعلق رکھنے والے اساتذہ کچھ زائد ڈیوٹی انجام دینی پڑتی ہے یا پھر صبح سویرے کلاس لینی پڑتی ہیں۔ اونچے طبقات کے اساتذہ بظاہر کھلے ذہن کے نظر آتے ہوں پھر بھی اپنی نجی زندگی میں فرسودہ ذہنیت کے حامل ہیں۔ چند اساتذہ نے گروہ بندی کی بھی شکایت کی اپنے کام کروانے کے لئے اساتذہ کو سفارش اور گروہوں میں شمولیت سے ہی مدد ملتی ہے۔

پیشوائی /یک طرفہ نظام:

ایک ٹیچر کے مطابق یونیورسٹی کا نظام کچھ حد تک جاگیردارانہ اور نوآبادیاتی ہے۔ یہاں طاقت کی طوطی بولتی ہے اور اوپر سے نیچے تک فیصلے اکثر یکطرفہ لئے جاتے ہیں خود انہوں نے بھی ایک شعبہ کے فیصلوں میں اس طرح کی ناانصافی محسوس کی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس طرح کے ماحول میں اساتذہ مایوس ہیں اور دوبارہ ٹیچر ایسوسی ایشن کی بازیابی سے بھی ان مسائل کے حل ہونے کا یقین نہیں رکھتے۔ بلکہ خود پچھلے ٹیچر ایسوسی ایشن کے صدر خود کو ٹیچرس کے منتخب نمائندے کے بجائے ان کا باس سمجھ لیا کرتے تھے۔ ٹیچرس کے مطابق بنارس ہندو یونیورسٹی میں تبدیلی صرف اس وقت ہی آسکتی ہے جب ایک ایسے وی۔سی۔ کا تقرر یونیورسٹی میں ہو جس میں شجاعت اور دلیری ہو اور وہ جمہوری اقدار کا حامل ہو۔

الیا ایکتا

دہلی یونیورسٹی طلباء یونین

زن، زر، ذات کا کھیل

اگر ہمیں DUSU کے انتخابات کی اہمیت کو سمجھنا ہے تو اس پر ایک وسیع نظر ڈالنی ہوگی۔ ہندوستان کے سب سے بڑے کیمپسوں میں شمار اس کیمپس کے طلباء نے 1954 کے بعد سے کئی انتخابات ہوتے دیکھے ہیں اور یہ بھی کہ کس طرح یہ انتخابات لوک سبھا اور راجیہ سبھا انتخابات سے مختلف نہیں ہوتے ہیں۔ کس طرح طلبہ کو لبھایا جاتا ہے کہ جو صرف بینک تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ایک ایسی جگہ جہاں ہم نے بہت سے طلبہ تنظیموں اور ان کے نمائندوں کے سورج کو پروان چڑھتے اور اترتے دیکھا ہے، اس بات کا احساس بہت آسانی سے ہوجاتا ہے کہ یہاں سیاست اپنی اصل شکل میں کھیلی جاتی ہے۔ یہاں کا ہر طالب علم کسی نہ کسی صورت سے سیاست اور سیاسی امتیازات کا حصہ ضرور ہوتا ہے۔ خواہ وہ ذات، طبقات و علاقائیت کی بنیاد پر ہو یا خصوصاً جنس کی بنیاد پر! اے بی وی پی جو کہ بھاجپا کی نمائندہ تنظیم ہے اور NSUI جسے کانگریس کی حمایت حاصل ہے ان طلباء تنظیموں کے نمائندہ رہنماؤں جیسے کہ ارون ہوڈا NSUI اور جیتیندر چودھری ABVP کو دیکھ کر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہاں کی سیاست میں ذات کا کردار کتنا اہم ہے۔ صرف وہی لوگ شرکت کرتے اور فتح یاب ہوتے ہیں جن کے پاس یا تو شناساؤں کی موروثی طاقتیں ہوں یا خود کے پیسے کا زور۔

اس سال DUSU کے انتخابات 12 ستمبر کو منعقد ہوئے۔ کیمپس کچھ یوں منظر پیش کر رہے تھے، جابجا نمائندہ امیدوار کچھ پچاس ساٹھ حمایتیوں کے ساتھ ہاروں سے سجے ہوئے کیمپس میں مختلف مقامات پر نعرے لگاتے یا اکثر کمرۂ جماعت، کالج کی دیواروں اور دروازوں پر انتخابات کے اشتہاری پوسٹرز لگاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہاں کیمپس میں اگر کسی طالب علم سے دریافت کیا جائے کہ "آیا لوگ یہاں کے پرسکون ماحول میں علم حاصل کرنے آتے ہیں؟" تو ان کا کہنا ہوتا ہے کہ "ہر وہ امیدوار جو ان انتخابات میں شریک ہوتا ہے، اس کا مقصد و نگاہوں کا مرکز قومی سیاسی جماعتیں ہوتی ہیں" اور اکثر چائے خانوں کے باہر طلبا کو گفتگو کرتے ہوئے سنا گیا کہ "ہم نے سنا ہے کہ لوگ یہاں مختلف شعبوں میں داخلہ ہی اسی غرض سے لیتے ہیں کہ وہ دہلی یونیورسٹی کے انتخابات میں شریک ہوسکیں اور قومی سطح کی سیاست کے لیے راہ ہموار کرسکیں۔" ایک طالب علم نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ اکثر فاتح امیدوار کسی ایک مخصوص فرقے یا جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً، جاٹ یا گجّر۔ ۲۰۱۶-۲۰۱۷ کے انتخابات میں چار عہدوں (صدر، نائب صدر، سکریٹری، جوائنٹ سکریٹری) کے حامل افراد انہیں جماعتوں سے تھے۔ ان جماعتوں سے متعلق افراد اپنے زور و طاقت اور جارحانہ تیوروں کی بنا پر بھی مشہور ہیں۔ اگر اس سال کے طلبا پر نظر کریں تو ABVP سے رجت چودھری اور NSUI سے راکی تسید ہیں۔ ان کے نزدیک انتخابات یا تو طاقت کے زور کی بنا پر جیتے جاتے ہیں یا علاقائیت اور ذات پات کی سیاست کی بنا پر۔ ذات پات کی سیاست کا یہ رجحان بہت بڑا چیلنج پیش کرتا ہے جمہوری خیال و طرز کو جو کہ مساوات، آزادی اور صاف ستھرے انتخابات کا مظہر ہیں۔ DUSU نمائندہ جوان رہنماؤں کی فراہمی کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ ایسے رہنما جو بہت سی خوبیوں اور عزت کے حامل ہیں اور قومی و بین الاقوامی سیاست میں اپنی موجودگی کا احساس دلا چکے ہیں۔ ارون جیٹلی، اجے ماکن، اور الکا لامبا ایسے سیاستدانوں کی چند بہت اہم مثالیں ہیں۔ یہ افراد DUSU سے منسلک رہے اور صدر و نائب صدر کے عہدوں تک پر بھی فائز ہوئے۔ اس سال DUSU کے CEO اور NSUI کے صدارتی امیدوار راکی تسید کے درمیان کافی کشمکش رہی اور ABVP کو بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کے خلاف نمٹنے کے لیے کافی جدوجہد کرنی پڑی۔ ووٹ دیکر لوگ جب باہر نکلے تو انھوں نے دیکھا کہ بہت سی سیاسی جماعتوں کے بڑی عمر کے ارکان اپنی نمائندہ تنظیموں اور امیدواروں کی حمایت کے لیے وہاں موجود تھے۔ یونیورسٹی اور کالج ہمیشہ پہلا مرحلہ و موقع رہے ہیں کیمپس کی سیاست و دیگر تحریکات کے لیے۔ قریب کے تین چار سالوں میں ہندوستان کے مختلف کیمپسوں میں ایک شورش و بغاوت دیکھنے کو ملی ہے۔ DU میں ABVP اور عام طلبہ کے درمیان ہاتھا پائی اور جھڑپ بھی سننے میں آئی۔ #studentagainstabvp ایک کافی با اثر و سود مند ٹرینڈ رہا جس نے پانچ سال بعد انتخابی نتائج پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔ #StudentsAgainstABVP نے طلبا میں ایک سیاسی بیداری لائی۔ لوگوں کو کیمپس میں ان کے حقوق کے بارے میں آگاہی ہوئی اور لوگوں نے آگے بڑھ کر کیمپس کو غنڈوں اور جارحانہ رجحانات والے اراکین سے پاک کرنے کا ارادہ کیا۔ "راجمس" کے سانحے کے بعد مختلف کالجیز سے طلبا نکل کر باہر سامنے آئے اور ABVP کے خلاف احتجاج درج کروایا۔ اور جیسے کہ نتائج سامنے آئے اس سال ABVP کو صرف دو عہدوں (secretary, joint secretary) پر اکتفا کرنا پڑا۔ ایسے گروپ عام طور پر لوگوں کے حقوق کی وکالت کرتے ہیں۔ یہ احتجاجات کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ۱۹۶۰ اور ۱۹۷۰ میں ہی شروع ہو گئے تھے۔ یہ بات ضرور دیکھنے میں آئی ہے کہ طلبا کی فعالیت ۲۰۰۹-۲۰۱۴ کے دور میں کافی تیزی سے پروان چڑھی ہے۔ اس معاملے میں اس ملک نے بہت سے چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ تقریباً ۳۰۰ احتجاجات ہر روز منعقد ہوتے ہیں۔ مانا جاتا ہے کہ یہ صرف اور صرف طلبا کی خون میں ڈوبی تحریروں اور غصہ چھلکاتے نعروں کی عظیم طاقت کی بدولت ممکن ہوسکا ہے۔ مختلف دشواریوں اور پریشانیوں کے باوجود یہ طلبا اکثر ریلی و مظاہرے کرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ جنہیں اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا جن کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ یونیورسٹی انتخابات طلبہ کو مواقع فراہم کرتے ہیں کہ کس طرح منظم طریقے سے اجتماعی طور پر ایک جیسی ذہنیت کے حامل افراد کسی مشترک سبب کو لے کر مارچ یا احتجاج کرسکیں۔ چنانچہ یہ انتخابات طلبا میں کثیر تنوع اور سوال کرنے کے جذبے کو بیدار رکھتے ہیں۔ ہم نے بہت سے طلبا کو دیکھا ہے جو آگے بڑھ کر بنیادی ضروریات کے لیے احتجاج درج کرواتے ہیں اور بہت سے اہم نکات و ضروریات کی جانب مرکزی حکومت کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ یہاں اثر پذیر ہونے کے لئے طلباء کا بڑی تعداد میں باہر آنا اور ووٹ دینے کی اہمیت کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ جمہوریت میں یہ بہت ضروری ہے کہ ہر ایک کی آواز سنی جائے اور اس پر غور کیا جائے۔ "کیا چیز صحیح ہے اور کیا غلط" اس بنیاد پر پرکھ کر ہر انسان کو فیصلہ لینے کی طاقت کا موجود ہونا، یہی جمہوریت کی خوبصورتی ہے۔

طلبہ یونین الیکشن کا جائزہ

چند مخصوص یونیورسٹیوں کے تناظر میں

زہیر احمد

ادھر چند ماہ سے پورے ہندوستان کے تعلیمی مراکز میں طلبہ یونین الیکشن کا دور جاری ہے ہماچل پردیش سے لے کر کیرلا تک اور گجرات سے آسام تک اکثر یونیورسٹیوں میں نئی طلبہ یونین کا انعقاد عمل میں آچکا ہے اور ابھی حال میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طلبہ یونین کا انتخاب اختتام پزیر ہوا ہے غالبا یہ اس سال کا آخری الیکشن ہوگا۔

علاوہ ازیں بہت سی ریاست اور یونیورسٹی کے اندر یا تو یونین الیکشن پر کلی پابندی عائد ہے یا وہ بالواسطہ طریقے سے انجام پاتا ہے حیدرآباد یونیورسٹی سے لے کر پونے تک اور کلکتہ یونیورسٹی سے دہلی یونیورسٹی تک کیمپس میں الیکشن کے تئیں ایک غیر معمولی دباو کی وجہ سے کچھ اعلیٰ ترین یونیورسٹیوں کے تناظر میں طلبہ یونین الیکشن کا جائزہ مندرجہ ذیل سطور میں پیش کیا جا رہا ہے۔

دہلی: ۱۔ دہلی یونیورسٹی،

۲۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی،

۳۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ

دہلی یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹس یونین میں عہدے اے بی وی پی اور این ایس یو آئی کے درمیان گردش میں رہے گزشتہ دو سالوں سے چاروں عہدے اے بی وی پی کے ہاتھوں میں رہے لیکن 2017 کے یونین الیکشن میں دو دو سیٹ دونوں کے حصے میں آئی ،این ایس یو آئی نے صدر اور نائب صدر کی سیٹ پر قبضہ کیا تو وہیں جنرل سکریٹری اور جوائنٹ سکریٹری پر اے بی وی پی کے امیدوار کامیاب ہوئے ، یہاں الیکشن مہم میں خطیر پیسوں کا استعمال اور الیکشن کوڈ کی نافرمانی بار ہا خبروں کی زینت بن چکی ہے۔

جے این یو اسٹوڈنٹس یونین پر 2008 سے 2011 تک پابندی عائد تھی سپریم کورٹ کی ہدایت کے بعد مارچ 2012 میں دوبارہ الیکشن عمل میں آیا اور یونین بحال ہوئی۔ 2016 کا الیکشن 9 نومبر کو عمل میں آیا جس میں اے آئی ایس اے کے کنہیا کمار اسٹوڈنٹس یونین کے صدر منتخب ہوئے اے آئی ایس اے کے دو اور بھی عہدیدار منتخب ہوئے ، کنہیا کمار اور ان کے حامی عمر خالد، انربان بھٹہ چاریہ اور شہلا راشد کو بغاوتی ہنگامہ کے بعد ملکی پیمانہ پر کافی شہرت حاصل ہوئی۔ 2017 کے الیکشن میں اے آئی ایس اے کی ہی امیدوار گیتا کماری صدر اور سیمون زویا خان نائب صدر منتخب ہوئیں اور ایس ایف آئی کے دگ گی لالہ جنرل سکریٹری اور ڈی ایس ایف کے شبھانشو سنگھ جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے ہیں۔ جے این یو اسٹوڈنٹس یونین پوری طرح طلبہ ہی کے ذریعہ انجام پاتی ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یونین الیکشن پر طلبہ کا انتظامیہ کے معاملات میں دخل اندازی کرنے کی وجہ سے 2006 سے پابندی عائد ہے۔ حالیہ دنوں طلبہ نے یونین کا معاملہ ایک بار پھر زور شور سے اٹھایا اور انتظامیہ سے یونین کی بحالی کا مطالبہ کیا لیکن کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

راجستھان: یونیورسٹی آف راجستھان، جے پور

2005 میں ہائی کورٹ نے پوری ریاست میں الیکشن پر پابندی لگا دی تھی لیکن اشوک گہلوت کی حکومت نے اس کو بحال کیا جو کہ خود 2001 سے 2010 تک این ایس یو آئی کے لیڈر رہ چکے ہیں ۔ 2014 میں ہائی کورٹ نے راجستھان یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹس یونین الیکشن کو ختم کر دیا تھا اس کے پیچھے جو وجہ بتائی وہ یہ تھی کہ 2013 کے الیکشن میں لنگدوہ کمیٹی کے ذریعہ پیش کردہ سفارشات کی کافی نافرمانی ہوئی تھی 31 اگست 2016 کے الیکشن میں ایک آزاد ممبر نے ایک، اور اے بی وی پی کے ممبران نے تین سیٹیں حاصل کیں۔ حالیہ الیکشن جو کہ 28 اگست 2017 کو ہوا تھا اس میں اے بی وی پی کو صرف ایک سیٹ پر جیت حاصل ہوئی اور این ایس یو آئی نے دو سیٹوں پر جیت درج کی جبکہ عہدہ صدارت پر ایک آزاد امیدوار کو جیت حاصل ہوئی۔

گجرات: گجرات یونیورسٹی، احمد آباد، مہاراجہ سیاجی راو یونیورسٹی، بڑودرہ

گجرات یونیورسٹی کے اندر اسٹوڈنٹس یونین نہیں ہے بلکہ یہاں ایک ایسا نظام ہے جو طلبہ کے دس نمائندوں کو اور سینٹ کے اٹھارہ ممبران کو منتخب کرتا ہے این ایس یو آئی نے جنوری 2015 کے الیکشن میں زیادہ تر سیٹوں پر کامیابی حاصل کی جبکہ اے بی وی پی نے دس میں سے چھ سیٹیں جیتیں، 2016 میں انتخاب نہیں ہو پایا۔ حال ہی میں ہونے والے انتخاب میں اے بی وی پی نے دس میں سے سات سیٹیں حاصل کیں۔ مہاراجہ سیاجی راو یونیورسٹی کے اندر 2014 اور 2015 میں کوئی الیکشن نہیں ہوا کیونکہ 2013 میں ایک عرضی داخل کی گئی تھی جس میں لنگدوہ کمیٹی کی سفارشات کی کھلی نافرمانی بتائی گئی تھی۔ ستمبر 2016 میں الیکشن عمل میں آیا جس میں این ایس یو آئی نے سکریٹری اور نائب صدر کے اہم منصب پر کامیابی حاصل کی۔ جبکہ 2017 کے الیکشن میں این ایس یو آئی کو ایک بھی سیٹ حاصل نہیں ہوئی، آزاد امیدوار پرینکا پٹیل نے ایک سیٹ پر جیت درج کی اور ایک سیٹ اے بی وی پی کے حصے میں آئی۔

پنجاب: پنجاب یونیورسٹی

اسٹوڈنٹس یونین کے چار ممبران پر مشتمل پنجاب یونیورسٹی میں مسلسل الیکشن ہوتا ہے۔ چاروں ممبران طلبہ کے درمیان ہی کے ہوتے ہیں ، 2015 میں چاروں ممبر اسٹوڈنٹ آرگنائزیشن آف انڈیا کے شرمانی اکالی دل سے تھے۔ این ایس یو آئی کو 2013,2014 دونوں میں جیت حاصل ہوئی تھی۔ 2016 کے الیکشن میں کئی پارٹیوں نے مل کر ایک متحدہ محاذ بنایا اور چاروں سیٹوں پر جیت درج کی۔ 2017 میں این ایس یو آئی نے تین سیٹوں پر جیت حاصل کی۔

ہریانہ: کروک چھیتر یونیورسٹی، کروک چھیتر

یہاں 1996 سے اب تک کوئی الیکشن نہیں ہوا ہے، جبکہ 2016 میں بی جے پی حکومت کا کہنا تھا کہ وہ اسے دوبارہ شروع کرائے گی اس کے لیے لائحہ عمل تیار کرلیا گیا ہے اور ایک کمیٹی بھی بنادی گئی ہے لیکن 2017 کے اختتام تک الیکشن کا یہ وعدہ پورا نہیں ہوسکا۔

مدھیہ پردیش: برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال

حکومت ریاست کے اندر اسٹوڈنٹس یونین الیکشن کے خلاف ہے، اس کے پیچھے وجہ یہ بتا رہی ہے کہ طلبہ کے اندر اس کی وجہ سے فساد کا خطرہ ہے آخری الیکشن 1980 میں ہوا تھا۔ جب سے اب تک کوئی الیکشن نہیں ہو پایا۔ جب کہ بالواسطہ الیکشن بھی 2011 سے بالکل بند ہے۔

مہاراشٹر: یونیورسٹی آف ممبئی، ممبئی،

یونیورسٹی آف پونے، پونے

1994 کے بعد یونیورسٹی کیمپس میں کافی ہنگامہ اور فساد ہوا جس کی وجہ سے بلاواسطہ یونین الیکشن پر پابندی اب تک عائد ہے۔ سب سے اہم تشدد این ایس یو آئی کے لیڈر آن ڈی سوزا کی طرف سے 1989 میں ہوا جب بالواسطہ اور میرٹ کی بنیاد پر انتخاب کا طریقہ رائج تھا، مہاراشٹر یونیورسٹی کا نیا ایکٹ پھر سے اسٹوڈنٹس یونین الیکشن کی اجازت دے رہا ہے، لیکن ابھی اس سلسلے میں کوئی ٹھوس قدم نہیں دکھائی دے رہا ہے۔

کیرلا:

یونیورسٹی آف کالی کٹ، کوڑھی کوڈ،

یونیورسٹی آف کیرلا، تریونتھ پورم

یہاں طلبہ سیاست کا ایک متحرک اور فعال کلچر نمایاں ہے۔ یونین کی طرف سے تیوہار اور احتجاج وغیرہ ہوتے ہیں، سالانہ الیکشن ایس یو، ایس ایف آئی، اے بی وی پی، ایم ایس ایف کے ذریعہ بالترتیب جیتا گیا، حالیہ یونین کے زیادہ تر عہدوں پر ایس ایف آئی حکومت کر رہی ہے۔

ہماچل پردیش: ہماچل پردیش یونیورسٹی، شملہ

یہاں 1970 سے کیمپس کے قیام کے بعد یکے بعد دیگرے تشدد کے واقعات رونما ہوتے رہے ہیں یہ تشدد خاص طور سے اے بی ایس ایف آئی اور اے بی وی پی کے مابین ہوتے رہے ہیں بالواسطہ الیکشن 2011 سے اب تک انہیں وجوہات سے نہیں ہوسکا اور اس وقت سے نامزدگی کا طریقہ ہی رائج ہے۔

اتر پردیش: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس

یونیورسٹی آف الہ آباد، الہ آباد

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹس یونین الیکشن کا عمل شروع ہی سے جاری و ساری رہا جبکہ 16-2015 میں لاء اینڈ آرڈر کے تحت یہ نہیں ہوسکا۔ لیکن اس کے بعد سے مسلسل جاری ہے۔ حالیہ الیکشن دسمبر 2017 میں منعقد ہوا یہ یونیورسٹی اس لحاظ سے دوسری یونیورسٹیوں سے ممتاز اور نمایاں ہے کہ یہاں کی طلبہ یونین کے امیدوار کسی سیاسی پارٹی کی طرف سے الیکشن نہیں لڑتے بلکہ یہاں طلبہ برادری کا اپنا ہی ممبر ہوا کرتا ہے۔ یہاں کی یونین صدر، نائب صدر اور معتمد اعزازی (سکریٹری) کے علاوہ دس اراکین کابینہ پر مشتمل ہوتی ہے۔

بنارس ہندو یونیورسٹی میں 1997 سے الیکشن نہیں ہوا ہے یونیورسٹی کے ذمہ داران کا کہنا ہے کہ وہ ان تمام مسائل کو حل کر رہے ہیں جو طلبہ کو درپیش ہیں لہٰذا اسٹوڈنٹس یونین کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جبکہ اے بی وی پی اور سماج وادی چھاتر سبھا کیمپس کے اندر کافی فعال ہے۔

الہ آباد یونیورسٹی کی طلبہ یونین کے سابق ذمہ داران کے مطابق الہ آباد یونیورسٹی میں یونین الیکشن پابندی سے ہو رہا ہے۔ گزشتہ سال سماج وادی پارٹی کی طلبہ تنظیم کی رہنما ریچا سنگھ الہ آباد یونیورسٹی کی پہلی خاتون صدر بنیں۔ انہوں نے اس وقت بی جے پی ایم پی یوگی آدتیہ ناتھ کا کیمپس میں آنے کے خلاف احتجاج کیا جس کی وجہ سے کافی تنازعہ پیدا ہوا۔ 2017 کے طلبہ یونین الیکشن میں بھی سماج وادی پارٹی کی طلبہ تنظیم ایس سی ایس نے پانچ میں سے چار سیٹوں پر جیت درج کی۔ جبکہ ایک سیٹ اے بی وی پی کے حصے میں آئی۔

بہار: یونیورسٹی آف پٹنہ

دسمبر 2012 میں پٹنہ یونیورسٹی کے اندر 28 سال بعد اسٹوڈنٹس یونین الیکشن عمل میں آیا، اس کے بعد کوئی الیکشن نہیں ہوا 2012 کے الیکشن میں سی پی آئی سے ملحق آل انڈیا اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن فیڈریشن نے پانچ میں سے دو سیٹیں جیتیں جبکہ بی جے پی اور جے ڈی نے ایک ایک سیٹ حاصل کیں۔

آندھرا پردیش: آندھرا یونیورسٹی، وشاکھا پٹنم،

یہ آندھرا پردیش کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔ یہاں 1988 سے اب تک کوئی یونین الیکشن نہیں ہوا ہے لیکن سیاسی پارٹیاں آندھرا یونیورسٹی میں کافی فعال اور متحرک ہیں۔

تلنگانہ: یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد

عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی میں ہر سال اسٹوڈنٹس یونین الیکشن عمل میں آتا ہے، یہاں اہم لڑائی ایس ایف آئی اور اے بی وی پی کے درمیان ہی ہوتی ہے جبکہ 2008 سے اے بی وی پی کو فتح حاصل نہیں ہوئی، ایس ایف آئی، ٹی ایس ایف، ڈی ایس یو اور ٹی وی وی نے ایک ساتھ مل کر 2015 کا الیکشن پوری طرح جیتا، ریسرچ اسکالر روہت ویمولہ جس نے جنوری 2016 میں خودکشی کر لی تھی وہ ڈی ایس یو اور ایس ایف آئی کا نمایاں حامی تھا۔ 2017 کے الیکشن میں بھی مختلف طلبہ تنظیموں نے مل کر ایک متحدہ محاذ اے ایس جے بنایا اور اسٹوڈنٹس یونین کی تمام سیٹوں پر جیت درج کی۔ یہاں اے بی وی پی اور این ایس یو آئی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں 1984 سے اب تک کوئی الیکشن نہیں ہوا ہے۔ 1988 میں آر ایس یو اور اے بی وی پی کے درمیان جھڑپ ہوئی تھی جس میں ایک طالب علم کی جان چلی گئی تھی جس کے بعد سے اسٹوڈنٹس یونین الیکشن پر کلی پابندی عائد ہے۔

اڑیسہ: اتکل یونیورسٹی، بھونیشور

اتکل یونیورسٹی کو حال ہی میں اسٹوڈنٹس یونین ملی ہے۔ الیکشن کے بعد، بیجو چھاتر جنتا دل اور بی جے ڈی کی اسٹوڈنٹس ونگ کو جیت ملی ہے پچھلے دو دہائی سے تشدد اور نافرمانی اسٹوڈنٹس یونین کی خاصیت رہی ہے غالباً اسی وجہ 15-13-2012 میں اسٹوڈنٹس یونین الیکشن نہیں ہوئے۔ 2017 میں یونیورسٹی نے الیکشن سے پہلے ہونے والے پر تشدد واقعات کے بعد اسٹوڈنٹس یونین الیکشن کینسل کر دیا۔

آسام: گوہاٹی یونیورسٹی، گوہاٹی

حال ہی میں آسام کی گوہاٹی یونیورسٹی کے کیمپس میں پوسٹ گریجویٹ اسٹوڈینٹس یونین کا انعقاد ہوا ایک بار پھر الیکشن میں آل آسام اسٹوڈنٹس یونین کو جیت حاصل ہوئی۔ آل آسام اسٹوڈنٹس یونین طلبہ کے بہت سے گروہوں کا مجموعہ ہے۔ گوہاٹی یونیورسٹی کو آسام کی سیاست میں کافی اہمیت حاصل ہے۔ اس طور سے کہ یہ لیڈروں اور سیاست دانوں کے لیے نرسری ہے۔

مغربی بنگال: یونیورسٹی آف کلکتہ

پریسیڈنسی یونیورسٹی، کلکتہ

جادوپور یونیورسٹی

کلکتہ یونیورسٹی میں ہر سال اسٹوڈنٹس یونین رہی ہے سوائے 15-2014 کے، ترنمول کانگریس کا بزور یونیورسٹی کی صدارت کے عہدے پر جولائی 2010 تک غلبہ رہا ہے۔

پریڈینسی یونیورسٹی میں 2011 سے 2013 کے بیچ الیکشن نہیں ہوئے جبکہ اینٹی اسٹیبلشمنٹ گروپ جس کو آئی سی کہا جاتا ہے وہ حکومت کرتا رہا ہے۔

جادوپور یونیورسٹی ہر اسٹریم کے لیے الگ الگ یونین رکھتی ہے یعنی آرٹ کے لیے الگ، سائنس کے لیے الگ اور انجینئرنگ کے لیے الگ یونین ہے۔ بائیں بازو سے وابستہ گروپ پچھلے دہائی سے جیت حاصل کر تا رہا ہے۔
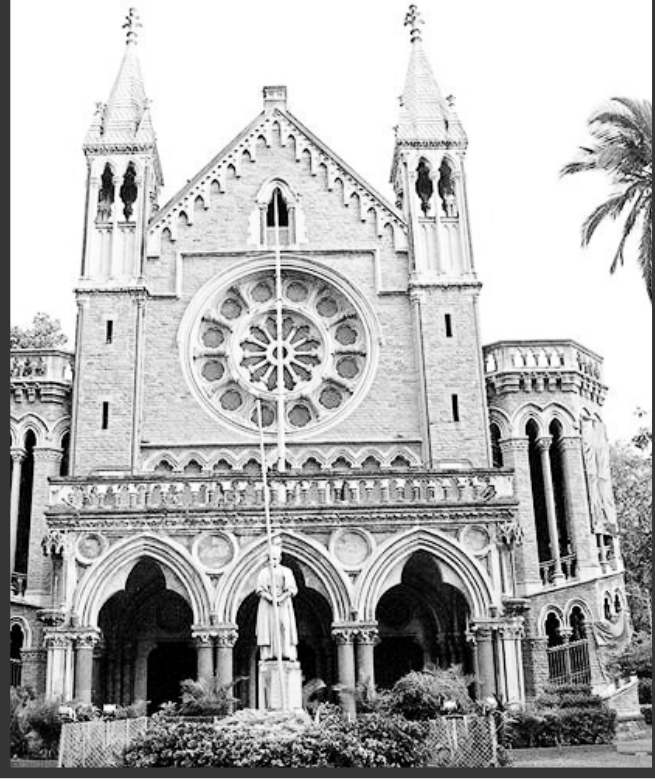
ممبئی میں طلبائی الیکشن

اکھیل اوکا

جب کہ ایک پر جوش مہم کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں اسی درمیان اکتوبر ۱۹۸۹ء میں ممبئی کالج کے احاطہ سے باہر ایک طالب علم کا بے دردی اور سفا کی سے قتل کر دیا گیا۔ اس واقعہ نے پورے ملک میں ایک سنسنی پیدا کر دی کیوں کہ مقتول NSUI کا ضلع صدر تھا۔ اس کربناک حادثہ کی وجہ سیاسی مسابقت سمجھی جا رہی تھی۔ اس واقعہ نے اسٹوڈنٹ الیکشن سے متعلق چند نئے سوالات کو جنم دیا۔ چند سالوں کے اندر صوبہ مہاراشٹر میں اسٹوڈنٹ الیکشن بین کر دیے گئے۔ مہاراشٹر یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۹۴ء کے ذریعہ الیکشن کے بجائے ذمہ داران کی نامزدگی کا طریقہ رائج کیا گیا۔ اس اہم فیصلے کی کئی اور وجوہات بھی تھیں جن میں ایک اہم وجہ طلبہ کا موجودہ سیاسی منظرنامہ میں اپنی جگہ اور مقام پیدا کر لینا بھی تھا۔

دوسری اہم وجہ عروس البلاد کا معاشی ڈھانچہ تھا جو کہ بتدریج آزاد معاشی اصلاح پر مبنی افکار سے متاثر ہو رہا تھا۔ جس کے باعث لوگوں کا مزاج تجارت اور اس پر ملنے والے فائدہ کی طرف راغب ہو رہا تھا۔ علاقائی پارٹی اور کانگریس کی عام افراد اور طلبہ پر گرفت کمزور ہوتی چلی گئی۔ طلبہ اور یونین الیکشن کی طرف بھی رجحانات میں کمی آنے لگی۔

اس حالت میں پوری دو دہائیاں گزر گئیں۔ ایک پوری نسل بالکل مختلف ماحول میں پروان چڑھ چکی ہے۔ جس کے ذہن میں اجتماعی جدوجہد کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس نسل کو جس تعلیمی ڈھانچہ سے سابقہ درپیش ہے اس میں اسکول سے لے کر اعلی تعلیم تک پیشہ وارانہ تعلیم کی جانب راغب کیا جاتا ہے۔ مہاراشٹر کے اندر ایسے کوچنگ سینٹرس اور انجینئرنگ کالجوں کی ایک کھیپ ہے جو سیاست دانوں کی سرپرستی میں طلبہ کو پروفیشنل تعلیم کی راہ دکھا رہے ہیں۔ کامرس بھی بہت سے طلبہ کی دلچسپی کا موضوع ہے۔ البتہ آرٹس اور ہیومینیٹیز کے مضامین کی طرف نظر التفات ڈالنے والے طلبہ کی تعداد خاصی کم ہے۔ یہ اس واقعہ کا ثبوت ہے کہ طلبہ اور مسائل حیات کے درمیان بتدریج فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ طلبہ کی بڑی تعداد کی نظر اس بات پر ہوتی ہے کہ کون سا کورس انہیں جلد ادارہ یا یونیورسٹی سے رخصت دے کر کمانے کے لائق بنا دے گا۔ اسی لیے بہت سے ہونہار طلبہ بھی ان سماجی حقائق سے بے خبر ہوتے ہیں جو کہ ان کی زندگیوں کو متاثر کرتے ہیں۔

ممبئی یونیورسٹی میں الیکشن

بحیثیت طالب علم مجھے اس حقیقت سے شناسائی کا موقع ملا جب کہ دوران طالب علمی مجھے چند سال ممبئی یونیورسٹی سے استفادہ کا نادر موقع ملا۔ یہاں تجربہ ہوا کہ اسٹوڈنٹ الیکشن کا نہ ہونا کس طرح پورے نظام کو متاثر کرتا ہے۔ خاص طور سے ستمبر ۲۰۱۵ء سے اگست ۲۰۱۶ء کا عرصہ شعبہ علم شہریت اور سیاست میں گزرا۔ جس کے بارے میں عام خیال ہے کہ یہاں کا ماحول بحث برائے تفہیم مکالمات، ڈبیٹ کے لیے سازگار ہوگا۔ یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ اس شعبے کے طلبہ زیادہ فعال اور سماجی مسائل کا درد اپنے دل میں رکھتے ہوں گے۔ لیکن اصل حقیقت اس سے بہت کچھ مختلف ہے۔ یہاں بہت سے مفید کورسس کاغذ کی زینت بنے ہوئے تھے اور طلبہ تک ان کی رسائی نہیں تھی۔ ڈپارٹمنٹ میں کوئی ایسا نظام نہیں تھا جس کے ذریعہ طلبہ اپنی شکایات، گزارشات اور مشورے درج کرا سکیں۔ وہاں کوئی ایسا فورم بھی نہیں تھا جس کے ذریعہ پروفیسر صاحبان کی جوابدہی یقینی بنائی جا سکے۔ بلکہ یہ بھی محال تھا کہ اساتذہ سے متعلقہ لیکچرس، مواد کے معیار، اسباق سے متعلق کوئی سوال کیا جا سکے۔ وہاں کوئی ایسا مطبع (Publishing house) نہیں تھا جو کہ طلبہ کے احساسات کی ترجمانی کرتا ہو۔ مزید یہ کہ Student Grievances Redressal Committee) اور دیگر کمیٹیاں مہاراشٹر پبلک یونین ایکٹ کا بل پیش ہونے تک غیر فعال کر دی گئی تھیں۔

حالت یہ ہے کہ اب طلباء اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یونیورسٹی کے ہر عہدہ دار کی غیر مشروط اطاعت کریں۔ چاہے وہ غلط راہ پر ہی کیوں نہ ہو۔ خاص طور سے پروفیسر کی کیوں کہ نمبرات کم ہو جانے کا ڈر انہیں اس رویہ پر ابھارتا ہے۔ طلبہ اور پروفیسر صاحبان کے درمیان پیچیدہ تعلقات، ربط کی کمی اور تساہل وغیرہ بھی اس رویہ کی وجوہات ہیں۔

ان دگرگوں حالات میں راقم السطور سمیت چند دیگر طلبہ نے ادارہ (یونیورسٹی اور ڈپارٹمنٹ) کی صورت حال میں تبدیلی لانے کی غرض سے کوششوں کا آغاز کیا۔ ہمارا احساس تھا کہ معیار تعلیم درس وتدریس طلباء کے مسائل کی سماعت وغیرہ مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ وہاں کوئی ایسا مکانزم موجود نہ تھا جہاں ہم اپنی شکایت یا مطالبات درج کراتے۔ اس لیے ہمیں تمام ان افراد تک یہ اپیل پہنچانی پڑی جو کہ کچھ کرنے کی پوزیشن میں تھے لیکن وہ سب پہلے ہی کسی نہ کسی عہد کے پابند تھے۔ اس لیے چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکتے تھے۔

حالت یہ ہے کہ اب طلباء اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یونیورسٹی کے ہر عہدہ دار کی غیر مشروط اطاعت کریں۔ چاہے وہ غلط راہ پر ہی کیوں نہ ہو۔ خاص طور سے پروفیسر کی کیوں کہ نمبرات کم ہو جانے کا ڈر انہیں اس رویہ پر ابھارتا ہے۔ طلبہ اور پروفیسر صاحبان کے درمیان پیچیدہ تعلقات، ربط کی کمی اور تساہل وغیرہ بھی اس رویہ کی وجوہات ہیں۔ لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے طلبہ کے ذریعہ کی جانے والی کسی جدوجہد میں حصہ نہیں لیا۔ کالج کی سطح پر کسی نمائندہ کا نہ ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہاں کے طلبہ سارے اختیارات کالج کے پروفیسر حضرات کے سپرد کر چکے ہیں اور وہ خود ناظرین کی صف میں شامل ہیں۔

موجودہ صورت حال اس ضرورت کا احساس دلاتی ہے کہ یونیورسٹی کی کوئی بھی پریشانی ان طلبہ کے ذریعہ حل کی جانی چاہیے جو کہ اپنے بل بوتے پر کچھ کرنے کا دم خم رکھتے ہوں۔ کیوں کہ یہاں ایک معمولی سی اصلاح مثلاً طلبہ سے ان کے احساسات معلوم کرنے کا میکانزم تشکیل دینا بھی ایک خطرناک مخالفت کی وجہ بن جاتی ہے۔

دوسری طرف چند یونیورسٹیاں ایسی بھی ہیں جو کہ اپنے پہلو میں طلباء کی عملی تربیت کا وافر سامان رکھتی ہیں۔ ان کے ہاں فعال یونین بھی ہے جو کہ تعلیم اور طلباء کے اہم مسائل کو حل کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ اس ضمن میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی قابل ذکر ہے۔ مثال کے طور پر یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی جانب سے جاری کردہ رہنما خطوط تمام تعلیمی اداروں میں ریگنگ، جنسی زیادتی اور دیگر شکایات کی سماعت کے سلسلے میں نشانات راہ کی وضاحت کرتے ہیں اس کے تحت ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تمام اہم پبلک مقامات جیسے کینٹین، نوٹس بورڈ وغیرہ پر ہیلپ لائن نمبر چسپاں کر دیے جاتے تاہم یونیورسٹی کی سطح پر ان ہدایات کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ طلبہ جنہیں ان حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ اس سے بھی ناواقف ہوتے ہیں کہ انہیں اس موقع پر کیا سہارا ڈھونڈنا چاہیے اور ان کے کیا حقوق ہیں۔ اب اگر ہم اپنے مطالبات پر دوبارہ نگاہ ڈالیں جو کہ طلباء کی شکایات کی سماعت کے نظام معیار تعلیم وتدریس میں بہتری وغیرہ سے متعلق ہیں۔ مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ طلباء کے مؤثر تحریک اس حالت کو بدلنے میں معاون ثابت ہوتی۔ ملک کے طول وعرض میں طلبہ کے ذریعہ کی جانے والی جدوجہد نے ہمیں یہ احساس دلایا کہ ہم اپنے حقوق واختیارات کو پہچاننے میں کس حد تک پچھڑے ہوئے ہیں۔

ہندوستان میں اسٹوڈنٹ یونین الیکشن

وطن عزیز میں ایک عرصہ سے طلبہ کے انتخابات کا عمل یونیورسٹیوں کے احاطے میں جاری ہے۔ مین اسٹریم سیاست میں شرکت اس ابتدائی مشق کا اہم مقصد تصور کیا جاتا رہا ہے۔ ایک زمانے میں طلباء تحریکوں نے ملک کی سیاست کو راست طور سے متاثر کیا ہے۔ مثلاً جے پرکاش نارائن موومنٹ نے اندرا گاندھی کے ذریعہ لگائی گئی ایمرجنسی کے خلاف اہم محاذ قائم کیا تھا۔ بہار سے ایک پوری نسل کے قدآور سیاسی رہنماؤں جن میں موجودہ کابینی وزیر روی شنکر پرشاد اور بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار بھی شامل ہیں جو کہ پٹنہ یونیورسٹی کے طلبائی انتخابات میں اپنی سیاسی پہچان بنا چکے تھے۔ تاہم ۱۹۸۰ء تک آتے آتے یہ صورت حال بدلتی چلی گئی۔ ریاست مہاراشٹر کے علاوہ دیگر ریاستیں جیسے آندھرا پردیش ہریانہ مدھیہ پردیش کی یونیورسٹیوں میں طلبہ کی سیاسی تحریکوں کا زوال ہونے لگا اور ان کا رول کم ہوتا چلا گیا۔ (انڈین اکسپریس ۲۰۱۶ء) الیکشن کی جگہ ذمہ داریوں پر طلبہ نامزد کیے جانے لگے۔ یہ معاملہ پچھلے چند سالوں سے اہل حل وعقد کے درمیان موضوع بحث بن چکا ہے۔

۲۰۰۵ء میں سپریم کورٹ (عدالت عظمیٰ) نے مرکزی حکومت کو متوجہ کیا تھا کہ وہ طلبائی انتخابات کے پورے مرحلے اور نشیب وفراز کو براہِ راست اپنی نگرانی میں دیکھے۔ اس کی شروعات الیکشن کی ضرورت اور افادیت پر زور دے کر کی جائے۔ اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ طلبہ کی ایک معیاری نمائندگی یونیورسٹی کی سطح پر ممکن ہو۔

تب ایک کمیٹی جس کی صدارت سابق چیف الیکشن کمشنر جے ایم لنگڈوہ تشکیل دی گئی۔ جس میں محترمہ زویا حسن جیسی نامور اسکالر بھی شامل تھیں۔ یہ کمیٹی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے ذریعہ تشکیل دی گئی تھی۔ تاکہ طلبائی الیکشن کے سلسلے میں سفارشات پیش کی جا سکیں۔ جب کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی تو سپریم کورٹ نے اس کے نفاذ کو سبھی یونیورسٹیوں میں یقینی بنانے پر زور دیا۔ سفارشات میں چند اہم مسائل الیکشن کے بنیادی ڈھانچے، مالی مسائل، عمر کی حد بندی اور سیاسی سمجھ سے متعلق تھیں۔ کمیٹی کے مطابق طلبائی الیکشن کچھ یونیورسٹیوں کے مزاج کے پیش نظر نہایت ضروری ہیں۔ بعض یونیورسٹیوں میں انکا ممنوع کر دیا جانا یا حوصلہ شکنی ہونا نظر ثانی کا طالب ہے۔ کمیٹی نے اس خیال پر حامی بھری کے نامزدگی کے طریقہ میں ایک بیچ کا مرحلہ بھی ہونا چاہیے۔ انہوں نے اس کی پانچ سالہ حد مقرر کر دی جس میں یا تو طلبا یونیورسٹی کی اعلیٰ سطحی باڈی کا انتخاب کریں یا صدر کو نامزد کر دیں۔ کمیٹی کی ان سفارشات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ میرٹ پر مبنی نامزدگی کا نظام بڑی حد تک غیر عملی تھا۔

دوسرا کام جو کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں انجام پایا وہ عمر کی حد کا تعین تھا یعنی زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم عمر کی حد کا تعین۔ یہ تفاوت ۲۱ سال سے ۲۸ سال تک کا رکھا گیا۔ علاوہ ازیں اس امر کو یقینی بنانے پر بھی زور دیا گیا کہ صرف یونیورسٹی کے ریگولر طلباء ہی الیکشن کے عمل میں حصہ لیں تاکہ الیکشن باہری عناصر کی دراندازی کے مضر اثرات سے محفوظ رہے۔

الیکشن کا پورا عمل ۱۰ دن کے اندر مکمل ہوجائے۔ اس بات کی سفارش بھی کی گئی علاوہ ازیں کوئی بھی امیدوار ۵۰۰۰ سے زیادہ خرچ نہ کرے۔ میٹنگ کے مقامات، پوسٹر آویزاں کرنے کا حلقہ، مہم کے اوقات وغیرہ پر یونیورسٹی انتظامیہ کا کنٹرول بنانے پر زور دیا گیا۔

تاہم ان سفارشات کا نفاذ اطمینان بخش نہیں رہا۔ ابتداء میں مختلف اسٹوڈنٹ یونین کی جانب سے سخت ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ مثلاً جے این یو کی جانب سے انتظامیہ کے کنٹرول پر سوال کھڑا کیا گیا۔ بہت سے حلقوں کی طرف سے الیکشن کے خرچ سے متعلق قائم کی گئیں حدود پر سوالیہ نشان لگایا گیا۔ بعض حلقوں کی جانب سے کہا گیا کہ یہ حقیقت سے دور اور غیر فطری وغیر عقلی ہے۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ کیونکہ بہت سی سیاسی پارٹیاں اپنے اسٹوڈنٹ ونگ بھی رکھتی ہیں جو کہ اسٹوڈنٹ الیکشن میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اس لیے باہری دخل اندازی کو روک پانا بہت مشکل ہے۔ اس کشمکش کے دوران بیشتر یونیورسٹیوں نے ایک عرصہ کے لیے اپنے الیکشن کے عمل کو موقوف کردیا۔ جبکہ چند یونیورسٹیوں جیسے جے این یو، ڈی یو اور یونیورسٹی آف حیدرآباد وغیرہ میں کچھ حدود کے اندر الیکشن کا عمل جاری رہا۔

مہاراشٹر حکومت کے فیصلے کو جو کہ اسٹوڈنٹ الیکشن کی اجازت دیتا ہے، جس کا نفاذ ۱۸۔۲۰۱۷ء کی میعاد سے ہوگا۔ اس تناظر میں اس فیصلے نے ایک ہلچل پیدا کردی۔ ایک طلباء کی باڈی مختلف سطحوں پر کام انجام دیتی ہے۔ یہ ایک فورم بھی ہوسکتا ہے جو کہ ایک خاص قسم کی فکر کی وکالت کرے اور اسے یونیورسٹی کی سطح پر اور اس کے باہر کسی خاص ایشو کر حل کرتے ہوئے پیش کرے۔ ایسے کسی گروپ کے رکن ہونے پر ایک طالب علم اپنے اندر ناقدانہ نگاہ پیدا کرتا ہے جو کہ اسے سماجی حقائق سے آگاہی میں مدد دیتی ہے۔ مختلف ذات مذاہب اور لسانی پس منظر رکھنے والے طلباء سے ملاقات اور روابط کے ذریعہ غیر ضروری جھجھک اور دوری ختم ہوتی ہے۔ اور ایک خاص مقصد کے حصول کے لیے کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنے کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ اسٹوڈنٹ باڈی طلباء اور پروفیسر صاحبان کے درمیان مفاہمت اور تعاون میں سازگار ثابت ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ طلبائی انتخابات جمہوری اقدار کے حصول کے لیے اور سماج کی بہتر نشونما اور جمہوری بنیادوں کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے۔

ایک ذمہ دار طالب علم اپنے آپ ہی پروفیسر، انتظامیہ کی طرف سے دی گئی ذمہ داری اور بالآخر پورے ملک کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھانے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر ممبئی یونیورسٹی نے ۲۰۱۷ء سے آن اسکرین امتحانات کی جانچ کا نظام شروع کیا۔ ایک ایجنسی کو یہ کارخیر سونپا گیا جس نے اس میں تاخیر کردی۔ اس کے نتیجہ میں پروفیسر حضرات جون کے پہلے ہفتہ تک بھی کاپی کی جانچ نہیں شروع کرسکے۔ شروع میں طلباء نے ''دیکھو اور انتظار کرو'' کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کیا۔ زیادہ تر طلبہ اس نئے سسٹم سے ناواقف تھے۔ صرف چند طلبہ کے حلقوں نے مشکل سوالات پوچھ کر اپنا احتجاج درج کرایا۔ تاہم یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ فیصلہ زمینی حقائق سے نظریں چرا کر بنا کسی تیاری کے مثلاً انفرااسٹرکچر، ہائی اسپیڈ انٹرنیٹ وغیرہ کی غیر موجودگی میں لیا گیا۔

طلباء یونین کو جب تک ہوش آیا تب تک حالات خراب ہوچکے تھے۔ احتجاج درج کرائے گئے اور میڈیا نے وائس چانسلر پر دباؤ ڈالا۔ بالآخر ان کو چھٹی پر بھیجنا پڑا۔

ایک منتخب اسٹوڈنٹ باڈی اس مسئلہ کو زیادہ اچھی طرح حل کرسکتی تھی۔ شروعات اس نکتہ سے ہوتی کہ وہ طلباء سے پہلے ان کی رائے معلوم کرتی کہ امتحان کی جانچ کے سلسلے میں کیا تبدیلی پیش نظر ہے اور اسے کیسے عملاً نافذ کیا جائے۔ یہ باڈی طلبہ کی آواز کو مؤثر طریقے سے اٹھاتی۔ اس طرح یونیورسٹی بھی طلباء کے نمائندوں کے سامنے جوابدہ ہوتی۔ اسٹوڈنٹ باڈیز انتظامیہ کو طلبہ کے مفاد کے خلاف اقدام سے روکنے میں اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔ وہ یہ باور کروانے میں کامیاب ہوسکتی تھیں کہ آن اسکرین جانچ یا تو مؤخر کردی جائے یا اس کا نفاذ دھیرے دھیرے جانچ کے بعد کیا جائے۔ تاہم ایک مضبوط حزب اختلاف ایسا بھی ہے جو طلبائی سیاست میں آنے والی کمی کو غلط ٹھہراتا ہے۔ یکے بعد دیگرے مظاہرے فکری مباحث، تشدد، یونیورسٹی انتظامیہ اور طلبہ کے درمیان ہونے والی جھڑپیں اور اساتذہ کا سیاست میں حصہ لینا وغیرہ نے سماج کے ایک حصے سے اپنا بھرم ختم کرلیا ہے۔ ملک کے مڈل کلاس طبقہ کے چند افراد کے لیے سیاست ایک خیالی پروفیشن بنتی جارہی ہے۔ یہ ڈر بھی پایا جاتا ہے کہ سیاسی پارٹیاں بڑے پیمانے پر یونین کا استعمال کہیں اپنے سیاسی مہرہ کے طور پر نہ کرلیں۔ اکثر اوقات یونیورسٹی یونین کا راست تعلق ریاست کی برسراقتدار پارٹی سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لفٹ آئیڈیالوجی سے متاثر یونین عرصہ دراز سے مغربی بنگال اور کیرلہ کے تعلیمی اداروں میں سیاسی محاذ سنبھالے ہوئے ہے جب کہ دوسری جانب NSUI کانگریس پارٹی کے زیراقتدار ریاست میں اپنا سکہ طلبہ کے درمیان رائج کیے ہوئے ہے۔

لیکن یہ حقائق اور خدشات اکثر میڈیا نظرانداز کرجاتا ہے اور محض سنسنی خیز مسائل کو چھیڑتا رہتا ہے۔ جب کہ دوسری جانب بہت سے روزمرہ کے مسائل ایسے ہیں جو نہ صرف یہ کہ طلبہ یونین کے ذریعہ اٹھائے جاتے ہیں بلکہ انکا حل بھی تلاش کیا جاتا ہے تاکہ طلبہ کی زندگی بہتر ہو۔ علاوہ ازیں ابھرتے ہوئے نوجوان سیاسی لیڈران موجودہ سیاسی منظرنامہ کو اعتدال کی راہ پر لانے میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔

صورتحال کی بہتری کے لیے طلبائی الیکشن کو دوبارہ بحال کرنا ہوگا۔ ممبئی یونیورسٹی کی مثال ہمارے سامنے ہے جو کہ لگاتار نظرانداز کی جاتی رہی۔ جس کی وجہ سے اسے بہت کچھ کھونا پڑا۔ اب وقت آگیا ہے کہ انتظامیہ طلبہ پر بھروسہ اور اعتماد کرتے ہوئے الیکشن کی شروعات کریں۔ اسٹوڈنٹ الیکشن میں یہ خوبی ہے کہ وہ تعلیم اور میدانِ عمل کے درمیان توازن قائم کرسکتا ہے۔

بنیادی نکتہ اس ضمن میں یہ ہے کہ طلبہ اس امر کو یقینی بنائیں کہ وہ دونوں محاذوں پر سرگرمی دکھائیں گے۔ انہیں یہ یقینی بنانا ہوگا کہ ان کے احتجاج اور مظاہرے پرامن ہوں گے اور وہ اپنی تعلیم کو متاثر نہیں ہونے دیں گے۔ الیکشن میں حصہ لینے کی عمر سے متعلق رہنما خطوط کی پاسداری کی جائے گی جو کہ کمیٹی نے واضح کردیے ہیں تاکہ سیاسی پارٹیوں کی دراندازی کو کم کیا جاسکے۔ آخری بات یہ کہ الیکشن بنیادی طور سے طلبہ کے مسائل کو حل کرنے کے لیے لڑے جائیں۔ طلبہ کی فلاح و بہبود ان انتخابات کا اولین مقصد ہو۔ راقم السطور اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ منتخب ہونے والی طلبہ کی باڈی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرے گی اور یونیورسٹی انتظامیہ کے سامنے جوابدہ ہوگی۔

ڈاکٹر سلیم خان

قرآن اور عروج و زوال کی داستان؟

سورۂ اعراف میں قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ اوراس کے پس پشت کارفرما عوامل کو مثالوں کے ساتھ نہایت دلنشین انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اس سورہ کے تعارف میں فرماتے ہیں ”اس میں پہلے ان (قوموں) کی فردقرارداد جرم کی طرف اجمالاً اشارہ کیا، اس کے بعد تفصیل کے ساتھ ان تمام پچھلی قوموں کی تاریخ سنائی جو اس ملک میں اقتدار پر آئیں اور پھر یکے بعد دیگرے اسی جرم میں کیفر کردار کو پہنچیں“۔ رب کائنات نے مختصر اور جامع تمہید کے بعد انسانوں کے دنیا میں بسائے جانے کا ذکر اس طور فرمایا کہ ”ہم نے تمھیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لیے یہاں سامان زیست فراہم کیا“ (اعراف ۱۰)۔ اس آیت میں تمکین سے مراد محض ٹھکانہ فراہم کرنا نہیں بلکہ اختیار، تصرف اور اقتدار سے نوازنا ہے۔

کائنات ہستی میں عروج وزوال کے طلسم ہوشربا کا مرکزی نکتہ یہی فکر و عمل کی آزادی ہے۔ جو مخلوقات اس صفت عالیہ سے محروم ہیں ان کے لیے نہ عروج ہے اور نہ زوال ہے۔ چرند، پرند، شجر، ہجر، چاند، تارے، ستارے، سیارے یہاں تک کہ فرشتوں کو بھی اس نعمت عظمیٰ سے سرفراز نہیں کیا گیا اس لیے وہ تغیر وارتقاء سے بے بہرہ جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ تصرف واقتدار کی خداداد صفت کے ساتھ عروج وزوال کا رخ متعین کرنے والے انسانی رویہ کی بھی نشاندہی اس آیت کے اختتامی فقرے میں کردی گئی ہے ”مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو“ (اعراف ۱۰) یعنی سپاس واحسان مندی کے بجائے کفر وانکار کی راہوں پر چلنے والے بلندی سے پستی کی جانب گامزن ہوتے ہیں۔ شکر وکفر کی میزان ہی عروج و زوال کی داستان رقم کرتی ہے۔

اس آفاقی وابدی اصول کو بیان کردینے کے بعد تخلیق آدم کا واقعہ بیان ہوا ہے جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ ”ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمہاری صورت بنائی، پھر فرشتوں سے کہا آدمؑ کو سجدہ کرو اس حکم پر سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا“ (اعراف ۱۱)۔ خالق کائنات نے حضرت آدمؑ کو متعارف کرنے کے لیے فرشتوں کی مجلس سجائی۔ اس میں ایک جن کی موجودگی اس کے عروج کی علامت تھی۔ علم و دانش نے اسے مہتمم بالشان محفل میں شرکت کا اہل بنایا مگر کبر وسرکشی اس کی بلندی کو نگل گئی اور وہ پستی کی انتہا پر پہنچ کر راندۂ درگاہ ہوگیا۔ مسجود الملوک آدم کے لیے ابلیس کے انجام بد میں درس عبرت تھا اور وہ خود اپنی رسوائی کا ذمہ دار تھا۔ ارشاد ربانی ہے ”اچھا تو یہاں سے نیچے اتر تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے نکل جا کہ درحقیقت تو ان لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں“ (اعراف ۱۳)۔

ابتدائے آفرینش کا یہ واقعہ گواہ ہے کہ بنی آدم کے سفر کی شروعات عروج سے ہوئی ہے۔ قیامِ بہشت کے دوران شیطان کے بہکاوے میں آکر اس نے اپنے مالک حقیقی کو غضبناک تو کیا مگر جب غلطی کا احساس ہوا تو ”دونوں (آدمؑ اور حوا) بول اٹھے، ”اے رب، ہم نے اپنے اوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے“ (اعراف ۲۳)۔ ابلیس کی ہٹ دھرمی کے برخلاف اپنے گناہ پر پچھتاوہ، رجوع الی اللہ اور توبہ و استغفار نے حضرت آدمؑ کو پھر سے سربلندی عطا کردی۔ جنت الفردوس میں اس آزمائش سے گزارنے کے بعد حضرت آدمؑ کو اُس زمین پر اتارا گیا جس کی خلافت ان کا مقصد تخلیق تھی۔ فرمایا، ”اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اور تمہارے لیے ایک خاص مدت تک زمین ہی میں جائے قرار اور سامان زیست ہے۔ وہیں تم کو جینا اور وہیں مرنا ہے اور اسی میں سے تم کو آخرکار نکالا جائے گا“ (اعراف ۲۴ تا ۲۵)۔

انفرادی بلندی وپستی کا ضابطہ بیان کردینے کے بعد سورہ اعراف میں قوموں کے عروج وزوال کے متعلق یہ حتمی فیصلہ صادر کیا گیا کہ ”ہر قوم کے لیے مہلت کی ایک مدت مقرر ہے، پھر جب کسی قوم کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی تاخیر وتقدیم بھی نہیں ہوتی“ (اعراف ۳۴)۔ آگے چل کر انسانی کامیابی وناکامی کو انبیاءؑ کے ساتھ ان کے سلوک سے جوڑ کر فرمایا گیا ”اے بنی آدم، یاد رکھو، اگر تمہارے پاس خود تم ہی میں

سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سنا رہے ہوں، تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویہ کی اصلاح کرلے گا اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلہ میں سرکشی برتیں گے وہی اہل دوزخ ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے (اعراف ۳۴ تا ۳۶)۔ اس اصول کا اطلاق انفرادی و اجتماعی دونوں سطح پر ہوتا ہے۔ اسی کے تحت قومیں دنیا میں دسرخرو اور کامیاب یا ذلیل ورسوا ہوتی ہیں۔ افراد کی آخرت اسی کی بنیاد پر سنورتی یا بگڑتی ہے۔ ویسے ابولہب یا اڈوانی جیسے لوگوں کو دنیا میں بھی ذلیل و خوار کردیا جاتا ہے۔

اس کے بعد جنت اور دوزخ کے درمیان کی دیوار پر بلند برجوں کے اوپر سے اعراف والے دونوں طرف کے لوگوں سے تبادلہ خیال کرتے نظر آتے ہیں۔ اس منظر میں وہ عروج پر پہنچنے والے خوش قسمت لوگوں پر تحیہ وسلام بھیجتے ہیں اور زوال پذیر ہونے والے بدبختوں سے کہتے ہیں ''دیکھ لیا تم نے، آج نہ تمہارے جتھے تمہارے کسی کام آئے اور نہ وہ ساز وسامان جن کو تم بڑی چیز سمجھتے تھے'' (اعراف ۴۸)۔ یعنی اللہ پر توکل کرنے کے بجائے فوج اور ساز وسامان پر فخر جتانے والے دنیا کے بعد آخرت میں رسوا کن عذاب کا شکار ہوتے ہیں۔ خدا فراموش آخرت کے منکرین کی گرفت اس طرح کی گئی ہے کہ ''جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تفریح بنا لیا تھا اور جنہیں دنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا اللہ فرماتا ہے کہ آج ہم بھی انہیں اسی طرح بھلا دیں گے جس طرح وہ اِس دن کی ملاقات کو بھولے رہے اور ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے'' (اعراف ۵۱)۔ اس بھیانک انجام کو بیان کرنے کے بعد اس سے بچنے کی شاہ کلید یہ کہہ کر عطا کی گئی کہ ''خبردار رہو! اُسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے'' (اعراف ۵۴)۔ اس حقیقت کو نظر انداز کردینے والا کبھی اپنے آگے دوسروں کے سر جھکانے کی سعیٔ بے سود کرتا ہے تو کبھی اپنے جیسے انسانوں کے آگے سربسجود ہوجاتا ہے۔ وہ رب کائنات کی اس تلقین کو بھول جاتا ہے کہ ''زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے'' (اعراف ۵۶)۔

حضرت آدمؑ کے بعد سورۂ اعراف میں ان انبیاء کی مختصر تاریخ بیان ہوئی ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے جزیرۃ العرب کے آس پاس مبعوث کیا تھا اور جن کے آثار نوادر سے عربی تجارتی قافلے واقف تھے۔ حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت شعیبؑ کی قومیں مختلف قسم کے فساد میں مبتلاء تھے۔ کہیں تعیش پسندی اور نمود و نمائش ان سے پہاڑوں میں محل بنواتی تھی تو کسی جگہ تفاخر و امتیاز ان کی راہ کا روڑا بن گیا تھا۔ کہیں اخلاقی انحطاط نے ہم جنسی کو خوشنما بنا دیا تھا۔ تو کوئی معاشی استحصال و بے ایمانی کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھا۔ انواع اقسام کی برائیوں میں گرفتار یہ قومیں اپنے اپنے وقت میں عروج پر تھیں۔ مادی ترقی نے انہیں خدا اور آخرت سے بیگانہ کردیا تھا۔ ان کی طرف مبعوث انبیاء نے جب انہیں غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے رعونت سے اللہ کا پیغام ٹھکرا دیا اور عذاب الٰہی کے مستحق بن گئے۔ ان کا عذاب بھی گمراہیوں کی مانند مختلف نوعیت کا تھا۔

سورہ اعراف میں بنی اسرائیل کے جلیل القدر نبی حضرت موسیٰؑ سے قبل ایک مکمل رکوع عروج وزوال کی ایسی عمومی تاریخ بیان کرتا ہے جس کا اطلاق ماضی کے ساتھ ساتھ مستقبل پر بھی ہوتا رہے گا۔ فرمانِ خداوندی ہے ''کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں نبی بھیجا ہو اور اُس بستی کے لوگوں کو پہلے تنگی اور سختی میں مبتلا نہ کیا ہو اس خیال سے کہ شاید وہ عاجزی پر اتر آئیں'' (اعراف ۹۴)۔ اس آیت میں تنگی و سختی سے گھمنڈ کا بت ٹوٹنے بمعنیٰ عجز وانکسار کے پیدا ہونے کی حکمت بیان ہوئی ہے۔ عام طور پر لوگ فقر و فاقہ میں اپنے خالق و مالک کو بہت یاد کرتے ہیں۔ اپنے گریبان میں جھانک کر جائزہ واحتساب لینے کے مواقع اس حالت میں زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ آزمائش عامتہ الناس میں سے بہت سوں کو راہِ راست پر لے آتی ہے۔

کفر والحاد سے بچانے کے لیے یہ آزمائش کافی ہے لیکن جذبۂ شکر کا شجر انعام واکرام کے بجائے سے جنم لیا ہے۔ انسان اپنے خالق و مالک سے یہ کہہ سکتا ہے کہ تو نے تو ہمیں ہمیشہ نانِ جویں کا محتاج رکھا، اگر نوازتا تو دیکھتا کہ ہم کس کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے۔ رب کائنات اتمامِ حجت سے قبل وہ صورتحال بھی برپا فرما دیتا ہے اور مادی نوازشیں قوموں ترقی کے مدارج طے کرواتی ہیں۔ قرآن کا فرمان ہے'' پھر ہم نے ان کی بدحالی کو خوش حالی سے بدل دیا یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پھولے'' (اعراف ۹۵)۔ اس احسان مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ شکر واعتراف کیا جائے۔ پاک پروردگار کی تعریف وتوصیف بیان کی جائے لیکن اکثر ایسا نہیں ہوتا۔ اکثر و بیشتر مواقع پر پسماندگی کا آسودگی میں بدل جانا غفلت ورعونت میں اضافہ کردیتا ہے۔ دنیا کی حرص وطلب بڑھ جاتی ہے اور اس کے بطن سے جبر واستحصال کا عفریت نمودار ہوجاتا ہے۔ ایسے میں عالمِ انسانیت کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی خاطر اور ان زنجیروں سے آزادی کے لیے جن میں لوگوں نے اپنے آپ کو اور دوسروں کو جکڑ رکھا ہوا انبیائے کرم کی دعوت لازم ہوجاتی ہے۔

قرآن حکیم میں جن انبیاء کا ذکر ہے ان میں سے بیشتر کی بعثت ترقی یافتہ اور طاقتور اقوام میں ہوئی ہے لیکن جب وہ عوام وخواص کو مالک حقیقی کا شکر بجالانے کی دعوت دیتے ہیں تو قوم بے نیازی کے ساتھ جواب دیتی ہے ''ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور برے دن آتے ہی رہے ہیں'' (اعراف ۹۵)۔ یہی احسان فراموشی اور ناقدری، اللہ کے غضب کو دعوت دیتی ہے اور پھر یہ ہوتا ہے کہ '' آخر کار ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا اور انہیں خبر تک نہ ہوئی'' (اعراف ۹۵)۔ رب کائنات اپنے بندوں سے بےحد محبت کرتا ہے اور نہیں چاہتا کہ ان کے عروج کو زوال میں بدل دے اسی لیے لوگوں کو اپنی سنت سے اس طرح آگاہ فرماتا ہے کہ ''اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے، مگر اُنھوں نے تو جھٹلایا، لہٰذا ہم نے اُس بری کمائی کے حساب میں انہیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے'' (اعراف ۹۶)۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ قوموں کے عروج کا زوال میں بدل جانا ان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے۔ اسی لیے فرمایا ''اللہ کی چال سے وہی قوم بےخوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو'' (اعراف ۹۹)۔ اس کے ساتھ تباہ ہونے والی اقوام کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان کی روشنی میں ہمیں اپنا جائزہ لینا چاہیے فرمایا ''ہم نے ان میں سے اکثر میں کوئی پاس عہد نہ پایا بلکہ اکثر کو فاسق ہی پایا'' (اعراف ۱۰۲)۔ اس میں شک نہیں کہ امت کے نہ صرف خشیت الٰہی سے بے نیاز ہوگئی ہے بلکہ خالق ومخلوق کے ساتھ بدعہدی اور فسق وفجور میں بھی بہت آگے نکل گئی ہے۔ اس عمومی گفتگو کے بعد حضرت موسیٰؑ کا تذکرہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ ''پھر اُن قوموں کے بعد (جن کا ذکر اوپر کیا گیا) ہم نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس بھیجا مگر انہوں نے بھی ہماری نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا، پس دیکھو کہ ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا'' (اعراف ۱۰۳)۔

حضرت یوسفؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر میں جا کر آباد ہوگئے تھے۔ آگے چل کر جب وہ انحطاط کا شکار ہوئے تو فرعون کو ان پر مسلط کردیا گیا۔ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ فرعون کا ظالمانہ سلوک اس کو لے ڈوبا اور اسے غرقاب کردیا گیا۔ اس کے بعد بنی

اسرائیل کو فلسطین میں غلبہ عطا کیا گیا لیکن پے در پے بدعہدی ان کو مختلف ارضی وسماوی آزمائشوں میں مبتلاء کرتی رہی۔ حضرت داودؑ سے قبل مشرک قوموں نے متحدہ حملہ کرکے بنی اسرائیل کو فلسطین سے بے دخل کر دیا اور تابوت سکینہ تک ان سے چھین کر لے گئے۔ نبی سموئیلؑ کے زمانے میں ان کی حمیت بیدار ہوئی اور طالوت کی قیادت میں جالوت سے جنگ کی۔ اس جنگ میں بظاہر کمزور نظر آنے والے گروہ (بنی اسرائیل) کو فتح مندی سے نوازا گیا۔ حضرت داودؑ اور ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ کی سلطنت بنی اسرائیل کی عروج کا زمانہ تھا۔ ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی قوم مائل بہ اصلاح ہو اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے کمر بستہ ہو تو اس کی مغلوبیت کو خدائے لم یزل غلبہ میں بدل دیتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے ۹۶۱ تا ۹۲۲ ق م کے دوران مسمار شدہ مسجد اقصیٰ کو اسی جگہ تعمیر کر دیا جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اسے بنایا تھا۔

بنی اسرائیل نے پھر دین سے انحراف اور شریعت سے کھلواڑ کیا۔ سرکشی کی اس انتہا کو پہنچے کہ ایک رقاصہ کے کہنے حضرت یحیٰیؑ کو شہید کر دیا۔ اس انحطاط کا لازمی تقاضہ مغلوبیت تھا۔ ۷۲۱ ق م میں آشوریوں نے حملہ کرکے مسجد اقصیٰ کو مسمار کر دیا۔ اس طرح عروج پھر سے زوال پذیر ہو گیا اور بخت نصر بنی اسرائیل کو غلام بنا کر بابل لے گیا۔ ایران کے سائرس نے وہاں سے آزاد کرایا اور وہ فلسطین واپس آئے تو سکندر اعظم نے حملہ کرکے بنی اسرائیل کو ملک سے نکال دیا۔ **یعنی دوسروں کے بل بوتے پر ظلم و جبر سے عارضی نجات تو مل جاتی ہے لیکن اگر کوئی قوم اس دوران اپنی صفوں کو منظم و مستحکم نہ کرے تو اس کا خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ وطن عزیز میں مختلف جماعتیں جب فسطائی طاقتوں کو شکست فاش سے دوچار کر دیتی ہیں تو ہمیں عارضی قلبی راحت تو ملتی ہے لیکن کوئی دیر پا فائدہ نہیں ہوتا۔ اس کے لیے امت اپنے داخلی محاذ پر اس طرح کام نہیں کرتی جیسا کہ ۱۶۵ ق م کے اندر بنی اسرائیل نے حضرت عزیرؑ کی قیادت میں تجدید واحیائے دین کی سعی کی تھی۔** اس کے نتیجے میں پھر سے ان کی ایک زبردست حکومت قائم ہوگئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی بنی اسرائیل دین کی جانب پلٹے ان کو غلبہ نصیب ہوا اور جب روگردانی کی تو مغلوبیت ان کا مقدر بن گئی۔

بنی اسرائیل جس وقت آشوریوں کی غلامی کا شکار تھے فلسطین کے مشرق میں ایران جیسی بڑی طاقت ابھر چکی تھی۔ اس نے بنی اسرائیل کو آزادی بھی دلوائی اور بغاوت کرنے پر اسے سزا بھی دی۔ مغرب کی جانب یونان میں افلاطون، سقراط اور ارسطو نے علم وفلسفہ کے میدان میں زبردست معرکہ سر کیے۔ اس علمی وفکری بالادستی نے سکندر اعظم جیسے فاتح عالم کو جنم دیا جو مصر وفلسطین کو روندتا ہوا ایران آیا اور وہاں فتح کا پرچم لہرا کر ہندوستان کی سرحد پر پہنچ گیا۔ عالم شباب میں دوران سفر سکندر اعظم کی اچانک وفات نے یونانیوں کو خانہ جنگی کا شکار کر دیا۔ ایک طرف یونانیوں کا زور ٹوٹا دوسری جانب بنی اسرائیل حضرت عزیرؑ کی قیادت میں مجتمع ہو گئے لیکن حضرت عیسیٰؑ کے انکار و دشمنی نے انہیں پھر سے برباد کر دیا۔

یہ ستم ظریفی ہے کہ عیسیٰؑ کو جس قوم کی جانب مبعوث کیا گیا تھا اس نے انہیں صلیب پر چڑھانے کی مذموم کوشش کی جبکہ ان سے برسرِ پیکار رومی اور یونانی ایمان لے آئے۔ تاریخ نے ایک اور پلٹا کھایا ۷۰ عیسوی میں رومی شہنشاہ ٹائٹس نے یہودیوں کو غلام بنا کر فلسطین سے باہر پھینک دیا۔ نبی کریمؐ کی بعثت کے وقت یہودی فلسطین وجزیرۃ العرب میں بکھرے ہوئے تھے لیکن نسلی عصبیت کی بناء پر وہ انکار کی روش پر قائم رہے اور مغلوبیت ان کا مقدر بنی رہی یہاں تک کہ بازنطینی بادشاہ نے ۶۳۶ عیسوی میں بیت المقدس حضرت عمرؓ کے حوالے کر دیا۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰؑ پر روم ویونان کے لوگ ایمان لے آئے اسی طرح نبی کریمؐ کی دعوت پر ایرانیوں نے لبیک کہا اور دین اسلام مشرق کی جانب پھیلتا چلا گیا۔ بنی اسرائیل میں جس طرح انبیاء کی بعثت ہوتی رہی اور ان کی نصرت یا بغاوت انہیں عروج یا زوال سے دوچار کرتی رہی اسی طرح امت مسلمہ کے اندر انبیائی مشن کو آگے بڑھانے والے علماء اور مجاہدین کے ساتھ ملت کا رویہ اس کے عروج وزوال کا سبب بنتا رہا۔ سرزمینِ ہند پر سید احمد شہید کی اسلامی تحریک کے ساتھ جس بے اعتنائی کا مظاہرہ ہندوستان کی امت مسلمہ نے کیا اس کی قیمت وہ اب تک چکا رہی ہے۔

تحریک اقامت دین تو قرآن مجید کی اس پکار پر لبیک کہہ کر اٹھتی ہے کہ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ اُن کا خیر خواہ ہے لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے''۔ اب اگر کوئی اپنے اقتدار کی خاطر یا اپنے دنیوی آقاوں کی خوشنودی کے لیے خدا پرستوں اور حق کے گواہوں کا دشمن بن جائے تو اس کا انجام تباہی و بربادی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟ ارشاد ربانی ہے ''جو لوگ اللہ کے احکام و ہدایات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں، جو خلق خدا میں عدل وراستی کا حکم دینے کے لیے اٹھیں، ان کو دردناک سزا کی خوش خبری سنادو'' (سورہ آل عمران ۲۱)۔ اس آیت میں پیغمبروں کے ناحق قتل کے شانہ بشانہ ایسے حق پرستوں کی ابتلاء و آزمائش کا ذکر کیا گیا ہے جو ظلم و ناانصافی کے خلاف عدل و قسط کا علم بلند کرتے ہیں اور ان پر ظلم ڈھانے والوں کو دردناک عذاب کی بشارت دی گئی جس کی مثالیں آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی نظر آتی ہیں۔

حضرت عثمان غنیؓ سے لے کر حضرت حسینؓ کی شہادت تک کے دل دہلا دینے والے سانحات نے اسلام کے نظام سیاست پر منفی اثرات مرتب کئے مگر تعلیم، عدالت، معاشرت اور حربی بالادستی کی وجہ سے مسلمانوں کو دنیا کے ایک بڑے حصے پر غلبہ حاصل رہا۔ لیکن خلافت عثمانیہ کے خاتمہ نے نہ صرف امت کے بین الاقوامی سیاسی اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ تاریخ کے اس موڑ پر پہلی بار امت نے اپنی فکری شکست کو تسلیم کر لیا اور اپنے سیاسی نظام کی بنیاد عقیدۂ خلافت کو نظریہ قومیت سے بدل دیا۔ ترکی قوم پرستی کے جواب میں عربی اور ایرانی قومیت کو فروغ حاصل ہوا۔ جنگ عظیم کے مغربی فاتحین نے مسلم دنیا کو جن مختلف ممالک میں تقسیم کیا ان میں سے ہر ایک کا منفرد تشخص دین اسلام کے بجائے وطن تھا۔ علامہ اقبال ان تبدیلیوں کے شاہد تھے۔ جنگ عظیم میں قوم پرست یوروپ کی تباہ کاری سے واقف اقبال جانتے تھے کہ وطن کا حصار ملی اتحاد کی پیٹھ میں خنجر ثابت ہوگا اور امت کی سیاست کو روحِ اسلامی سے محروم کرکے منتشر کر دے گا۔ اس لئے حکیم الامت نے واشگاف انداز میں خبر دار کیا۔

ان تازہ خداوں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

قوم پرستی کے نشے میں چور مسلم حکمراں بظاہر روشن خیال نظر آتے تھے لیکن وہ اسلام کی مخالفت میں بہت شدید تھے۔ مصطفیٰ کمال اتاترک کی شدت پسندی کا یہ عالم تھا کہ وہ اذان

ونماز میں بھی عربی کا روادار نہیں تھا بلکہ ترکی زبان پر اصرار کرتا تھا۔ ایران کا رضا شاہ پہلوی بھی اسلام کا کٹرّ دشمن تھا۔ ان ظالم حکمرانوں میں سے ایک بادشاہ اور دوسرا فوجی آمر تھا، ایک شیعہ و دوسرا سنی تھا مگر دونوں اپنی اسلام دشمنی کے سبب مغرب کے منظورِ نظر تھے۔ اسی طرح غیر جانبدار ممالک کی تحریک کا اہم ستون اور جو عرب ممالک کی تنظیم کا سربراہ اشتراکیت نواز جمال عبدالناصر بھی اسلام دشمنی میں پیش پیش تھا۔ شام کے حافظ اسد اور عراق کے صدام حسین اس کے ہمنوا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق وسطیٰ میں جبر و ظلم کے خلاف اسلام کے احیاء کی بڑی تحریکیں مصر، ترکی اور ایران سے اٹھیں بقول صفی لکھنوی ؎

اس دین کی فطرت میں قدرت کے لچک دی ہے
اُتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

مشرق وسطیٰ کے زیرو بم کو اگر اسلام پسندوں اور اس کے دشمنوں کی کشمکش کے تناظر میں دیکھا جائے تو حالیہ تاریخ نہایت دلچسپ انکشافات کرتی ہے۔ یہاں اسلام پسند سے مراد وہ تحریکات ہیں جو مغرب سے مستعار فاسد نظریات مثلاً قوم پرستی، لادینیت، اشتراکیت اور سرمایہ داری کو مسترد کر کے زندگی کے تمام شعبوں بشمول سیاست میں دین کا نفاذ چاہتی ہیں۔ اس کے برعکس اسلام دشمن وہ عناصر ہیں جو اسلام کو سیاست سے خارج کرنے کا دعویٰ کر کے عملاً زندگی کے تمام شعبوں سے بے دخل کر دینا چاہتے ہیں۔ مغرب کے یہ ذہنی غلام دین اسلام کو عبادات اور انفرادی زندگی تک محدود کر دینے کے قائل تو ہیں لیکن ان کی اپنی ذاتی زندگی بھی دین سے خالی نظر آتی ہے۔ مغرب زدہ مسلم حکمرانوں نے اسلامی تحریک کے نظریاتی چیلنج کو اپنے اقتدار کیلئے خطرہ سمجھ کر اس کی سرکوبی تو کی لیکن اپنے ناپاک مقاصد میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان میں سے ہر ایک رسوا ہو کر دنیا سے گیا۔ اس لئے کہ ارشاد ربانی ہے: ''اور یاد رکھو، تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے''۔ (ابراہیم ۷)۔

ترکی میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے اسلام کی بیخ کنی میں ساری اخلاقی حدود و قیود کو پامال کیا۔ شراب نوشی نے اتاترک کا جگر تباہ کر دیا تھا اور آخری وقت میں اسے سرخ چیونٹی کا مرض لاحق ہو گیا (جس میں یوں محسوس ہوتا ہے گویا سارے جسم پر چیونٹیاں رینگ رہی ہیں)۔ اس کے بعد وہ بے چینی کے عالم میں مختلف محلات میں مارا مارا پھرتا رہا اور بالآخر دم توڑ دیا۔ اس کے الحاد کی شدت اس قدر تھی کہ اول تو کسی نے نماز جنازہ پڑھانے کی جرأت نہیں کی اور جب بہن نے اصرار کیا تو وہ نماز عربی کے بجائے ترکی زبان میں پڑھائی گئی۔ اتاترک کی موت کے بعد مغرب پرست دانشوروں، فوجیوں، ججوں اور انتظامیہ میں بڑے عہدوں پر فائز افسران نے ظلم و جور کا بازار گرم رکھا۔ عوام کی مرضی سے اقتدار میں آنے والے حکمرانوں کو نہ صرف برطرف بلکہ کھلے عام تختۂ دار پر چڑھانے کی مذموم حرکت بھی کر ڈالی اس کے باوجود ترکی کے اندر پھر سے اسلام پسند غالب ہو گئے اور اب ان کی حکومت ہے۔ اس کا تختہ الٹنے کی فوجی کوشش کو عوام نے میدان میں اتر کر ناکام بنا دیا۔

ایران میں بھی جب اسلامی بیداری آئی تو شاہ ایران نے اسلام پسندوں کے خلاف اسرائیل کی موساد تک کا تعاون لینے سے گریز نہیں کیا اور اسلام پسندوں کو نہ صرف سخت سزائیں دیں بلکہ ملک بدر کر دیا۔ بالآخر رضا شاہ پہلوی کا جبر شکست کھا گیا۔ اس کو وطن چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ امریکہ نے اپنے ملک میں پناہ دینے سے انکار کر دیا اور وہ مصر کے اندر گمنامی کی موت مرا۔ اس شہنشاہ کی تدفین اس کے اپنے گھر کے اندر کسمپرسی کے عالم میں ہوئی کہیں ایک آنسو نہیں بہا۔ ایران میں اسلامی انقلاب کو کچلنے کیلئے جس صدام حسین کو امریکہ اور روس نے جنگ پر آمادہ کیا وہ امریکی فوج کشی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ایک زمانے تک یاسر عرفات کے ساتھ مسلم دنیا تھی لیکن اب الفتح کا دبدبہ ختم ہو چکا ہے اور فلسطینی مسلمانوں کی قیادت اسلامی تحریک حماس کے ہاتھوں میں آ گئی ہے۔ آج اسرائیل بھی حماس سے خوفزدہ ہے اور ساری دنیا محمود عباس کے بجائے اسماعیل ہنیہ کو اہمیت دیتی ہے۔

مصر کے جمال عبدالناصر کو اپنی فوجی طاقت پر بہت ناز تھا۔ شام میں اس کا ہم فکر حافظ الاسد برسرِ اقتدار تھا۔ ان دونوں نے مل کر بیک وقت اسرائیل پر حملہ کر دیا مگر ابتدائی کامیابی کے بعد انہیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور صحرائے سینا ہاتھ سے نکل گیا۔ اس ناکامی نے عرب دنیا میں ناصر کو بے وزن کر دیا موت سے قبل اسے عربوں کی سربراہی سے معزول کر دیا گیا۔ اس کا وارث انور سادات سوویت کیمپ سے نکل کر امریکہ کا بندۂ بے دام بن گیا۔ اسرائیل سے معاہدے کے سبب وہ فوجی پریڈ کے دوران قتل کر دیا گیا۔ انور سادات کا دست راست حسنی مبارک عوامی احتجاج کے نتیجے میں رسوا ہو کر گیا اور اولین غیر جاندارانہ انتخابات کے تینوں مرحلوں میں وہی اخوان المسلمون کامیاب رہی جسے مغرب نوازوں نے نیست و نابود کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی فرمان خداوندی ہے: ''کہو! خدایا! مُلک کے مالک! تو جسے چاہے، حکومت دے اور جسے چاہے، چھین لے جسے چاہے، عزت بخشے اور جس کو چاہے، ذلیل کر دے بھلائی تیرے اختیار میں ہے بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے (آل عمران ۲۶)''۔

مصر کے اسلامی انقلاب کا تختہ سازش اور فوجی بغاوت سے الٹ دیا گیا اس لئے کہ اس سے اسرائیل، عرب حکمراں اور ان کے مغربی آقا خوفزدہ ہو گئے تھے۔ اسلامی بہار سے قبل جزیرۃ العرب کے حکمران اسلامی تحریکات کو اپنے اقتدار کیلئے خطرہ نہیں سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ مصر و شام کے معتوب اخوانیوں کو سعودی عرب، کویت، امارات اور قطر میں پناہ مل جاتی تھی۔ جزیرۃ العرب میں تعلیمی ترقی، طبی سہولیات، معاشی استحکام، بلدیاتی نظام اور دینی بیداری میں اخوانی اساتذہ اور دانشوروں کے کردار سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مصر میں اخوانی حکومت کے بعد مسلم حکمرانوں کو یہ خوف دلایا گیا کہ یہ اسلامی لہر ان کو تخت و تاج سے بے دخل کر دے گی۔ اس لئے وہ اخوانیوں کو اقتدار سے ہٹانے کے گھناونے کھیل میں شامل ہو گئے۔ پہلی مرتبہ تیل کی دولت کا بے دریغ استعمال اسلام پسندوں کا ناحق خون بہانے کیلئے کیا گیا اور تختہ الٹنے کے بعد اس پر علی الاعلان مسرت کا اظہار اس آیت کی مصداق کیا گیا: ''اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے رزق میں فراخی کر دیتا تو وہ زمین میں فساد کرنے لگتے لیکن اللہ جس قدر چاہتا ہے اندازے کے ساتھ نازل کرتا ہے''۔ (الشوریٰ ۲۷)

اس سازش میں شامل ہونے والوں کے لئے نعمتِ الٰہی کی ناقدری بے برکتی بن گئی۔ تیل کے بھاو ایسے گرے کہ دولت کا نشہ کافور ہو گیا۔ اس پر یمن کی جنگ نے نہ صرف خزانہ خالی کیا بلکہ رسوائی سے دوچار کیا۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ فی الحال یمن کی راجدھانی سناء بظاہر کمزور نظر آنے والے حوثیوں کے قبضے میں ہے اور بزورِ قوت حصول کا امکان مفقود ہے۔ آلِ سعود کی خانہ جنگی نے سعودی عرب کے اقتدار کو ایک آتش فشاں کے دہانے پر پہنچا دیا ہے۔ امریکہ کی شئے پر مصر میں تختہ الٹا گیا تھا لیکن ۱۱ ستمبر کے نقصان کی بھرپائی کا قانون بنا کر اس نے سعودی عرب کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا۔ ڈاکٹر محمد مورسی کو اقتدار سے ہٹا کر جس عبدالفتاح السیسی کو اقتدار میں لایا گیا تھا اس سے چند غیر آباد جزیروں کو لے کر سعودی عرب تعلقات بے حد خراب ہو گئے ہیں۔ اسلام پسندوں کے خلاف ایک

دوسرے کے ہمنوا سعودی حکمراں اور السیسی ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ہیں۔

ایران کو مشیت نے ایک عرصہ تک مغرب کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھا۔ جنگ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی معاشی مقاطعہ کے باوجود وہ مستقل حماس اور فلسطین کی حمایت کرتا رہا۔ اس کی پرورش کردہ حزب اللہ نے اسرائیل کو ناکوں چنے چبوادیئے اور حمایت یافتہ حوثیوں کو بھی کامیابی ملی لیکن شام کے اندر ایران کے رہنماوں نے خود اپنے پیر پر کلہاڑی چلادی۔ ساری دنیا میں مستضعفین کی حمایت کا دم بھرنے والے شام میں اسلام پسندوں کے بجائے ظالم بشار الاسد کے ساتھ ہوگئے۔ روس جب اپنے فوجی اڈے کو بچانے کی خاطر شام کی سرزمین پر آسمان سے بم برسا رہا تھا تو زمین پر حزب اللہ کے جنگجو شیطان لعین بشار کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر علی الاعلان مظلوموں کا ناحق خون بہا رہے تھے۔ قومی مفاد نے ایرانی حکمرانوں کو ان کے فرضِ منصبی سے غافل کردیا۔ جیسا کہ ارشاد ہے: ''رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا ہے، تو انہیں ہم بتدریج ایسے طریقہ سے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انہیں خبر تک نہ ہوگی۔ میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں، میری چال کا کوئی توڑ نہیں ہے'' (اعراف ۱۸۲، ۱۸۳)

ترکی نے جب روسی طیارے کو مار گرایا تو دونوں پڑوسی ممالک کے تعلقات بے حد کشیدہ ہوگئے لیکن فوجی بغاوت کی ناکامی کے بعد ترکوں نے امریکہ سے قطع تعلق کر کے روس کی جانب ہاتھ بڑھایا اور شام کے مسئلہ میں وہ ایک اہم فریق بن گیا جس سے ایران کی سیاسی بساط سمٹ گئی۔ ایران کی مرضی کے خلاف ترکی روس کو جنگ بندی پر راضی کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ایران پر لگی اقتصادی پابندیاں جب ختم ہوئیں تو مغرب ایران کے اسی طرح کے قصیدے پڑھنے لگا جیسے دبئی کے پڑھا کرتا تھا اور ایرانی وزیر خارجہ نے داعش کی دہشت گردی کیلئے سعودی عرب کو اسی طرح ذمہ دار ٹھہرادیا جیسے کہ کبھی سعودی حکمراں اسلامی شدت پسندی کیلئے ایران کو موردِ الزام ٹھہراتے تھے لیکن امریکہ اور ایران کی دوستی کے دن اوبامہ کے ساتھ لد گئے اور ڈونالڈ ٹرمپ نے ایران کے تئیں وہی قدیم معاندانہ موقف اختیار کرلیا ہے۔

ڈونالڈ ٹرمپ کے اقتدار میں آتے ہی امریکی انتظامیہ نے عربوں کے ساتھ پینگیں بڑھانی شروع کردیں اور ایران پر شکنجہ کسنے لگا۔ ایرانی حکمرانوں کا دماغ ٹھکانے آرہا اور وہ پھر سے مسلم ممالک کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ ایران کے صدر نے عمان، کویت اور پاکستان کا دورہ کر کے باہمی احترام و تعاون اور اتحاد و اعتماد کی فضا بنانے کی سعی کرچکے ہیں۔ خلیجی تعاون کونسل کے ارکان نے اس اقدام کا خیر مقدم کیا تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان ممالک قومی اور ذاتی مفادات سے اٹھ کر اسلامی اخوت کا رشتہ استوار کریں۔ اپنے تنازعات باہم گفت و شنید سے حل کریں تاکہ دشمن کو اس کی آڑ میں امت کی معیشت اور قیمتی جانوں کو ضائع کرنے کا موقع نہ ملے۔ اللہ تعالیٰ نے جو بیش بہا مادی نعمتیں عطا کی ہیں اور ایمان کی جس نعمت عظمیٰ سے نوازہ ہے اس کی ناقدری سے بچیں اس لئے کہ نبیؐ رحمت کا رشاد ہے: ''نافرمانیاں نعمت کو یوں کھا جاتی ہیں جیسے آگ لکڑی کو۔ جب تو دیکھے کہ نافرمانی کے باوجود تم پر نعمتیں پوری طرح نازل ہورہی ہیں تو تجھے ڈرنا چاہیے کہ یہ استدراج ہوسکتا ہے''۔

دنیا بھر میں تحریکات اسلامی کم وبیش ان حالات سے دوچار ہیں جن سے نبی کریمؐ مکہ مکرمہ میں نبرد آزما تھے۔ کبھی ان پر دباو ڈالا جاتا ہے تو کبھی ان سے مفاہمت کی کوشش کی جاتی ہے۔ مفسرین نے سورہ ص کا یہی پس منظر بیان کیا ہے۔ اس سورہ میں پہلے خالق کائنات اپنے حبیب مکرمؐ کی ڈھارس بندھاتا ہے: ''اے نبیؐ، صبر کرو اُن باتوں پر جو یہ لوگ بناتے ہیں'' (سورہ ص ۱۷)۔ اس کے بعد حکم دیا کہ ان سرکش و باغی حکمرانوں کے مقابلے جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے ایک فرمانبردار فرمانروا کی صفات عالیہ سے انہیں آگاہ کرو: ''اور ان کے سامنے ہمارے بندے داوٗدؑ کا قصہ بیان کرو جو بڑی قوتوں کا مالک تھا ہر معاملہ میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والا تھا۔ ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ مسخر کر رکھا تھا کہ صبح و شام وہ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ پرندے سمٹ آتے اور سب کے سب اُس کی تسبیح کی طرف متوجہ ہوجاتے تھے'' (سورہ ص ۱۷ تا ۱۹)۔

حضرت داوٗدؑ کوئی گوشہ نشین بزرگ نہیں تھے بلکہ ان کی بابت یہ بھی فرمایا کہ: ''ہم نے اس کی سلطنت مضبوط کردی تھے، اس کو حکمت عطا کی تھی اور فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بخشی تھی'' (سورہ ص ۲۰)۔ اس تعارف کے بعد حضرت داوٗدؑ کے سامنے پیش ہونے والے ایک قضیہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا گیا اور خلاصہ کلام اس طرح بیان ہوا کہ: '' (ہم نے اس سے کہا) ''اے داوٗدؑ، ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یقیناً اُن کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے'' (سورہ ص ۲۶)۔ اس آیت میں جہاں حق کے ساتھ حکومت کرنے کی تلقین ہے وہیں خواہش نفس کے چور دروازے کا ذکر بھی کردیا گیا ہے جس سے داخل ہوکر شیطان اپنی پیروی کرواتا ہے۔ اسی کے ساتھ خواہش نفس پر لگام لگانے کیلئے اپنے خلیفہ ہونے کا استحضار اور یوم الحساب میں جوابدہی کا احساس بھی پیدا کیا گیا۔

ابلیس چونکہ خود گھمنڈی ہے اس لئے وہ حکمرانوں کو بہ آسانی تکبر کے جال میں پھنسا لیتا ہے۔ شیطان کی بابت قرآن حکیم بار بار خبردار کرتا ہے کہ وہ انسانوں کا کھلا دشمن ہے۔ وہ حکمرانوں کو اقتدار بچانے کیلئے ظلم وستم کی حکمت عملی سجھاتا ہے اور وہ اسے اپنا خیر خواہ سمجھ کر جبر و ظلم کی راستے پر چل پڑتے ہیں۔ یہ تباہی کا راستہ بالآخران کو اقتدار سے محروم کردیتا ہے لیکن جس وقت انہیں اس کا احساس ہوتا ہے بہت دیر ہوچکی ہے۔ اس انجام بد سے بچنے کی واحد سبیل یہ ہدایت ہے کہ: ''اے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہوجاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ جو صاف صاف ہدایات تمہارے پاس آچکی ہیں، اگر ان کو پالینے کے بعد پھر تم نے لغزش کھائی، تو خوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور حکیم ودانا ہے (البقرہ ۲۰۸، ۲۰۹)۔

حکمراں طبقہ جب تک اپنے آپ کو اللہ کا خلیفہ اور اقتدار کو اللہ کی امانت سمجھتا ہے شیطان کی چالوں سے محفوظ و مامون رہتا ہے۔ قوم عروج پر ہوتی ہے لیکن جب یہ شعور کمزور ہوجاتا ہے۔ وہ خدا کے اقتدار اعلیٰ کا انکار کر کے اپنی من مانی کرنے لگتے ہیں اور قوم بھی خوف یا ابن الوقتی کا شکار ہوکر ان کا ہاتھ بٹانے لگتی ہے تو وہ دشمن کیلئے نرم چارہ اور آلۂ کار بن زوال پذیر ہوجاتی ہے۔ شیطان کے فریب میں آکر طاوس رباب پر فریفتہ ہوجانے والوں کے شمشیر و سناں کا ہدف دشمن نہیں دوست ہوتے ہیں حالانکہ اس کی یہ صفت بتائی گئی تھی کہ: ''۔۔۔ (وہ) کافروں پر بہت سخت اور زورآور ہیں آپس میں بہت نرم دل اور شفیق ہوتے ہیں (فتح ۲۹)۔ بقول اقبال اس دورِ پرفتن میں امت کے عروج کا راز اسی شاہ کلید سے کھل سکتا ہے کہ ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اسلام کے مقابلہ میں دیگر ادیان کی حیثیت

ابوسعد اعظمی

عصر حاضر میں تقابل ادیان کا ایک طویل سلسلہ ہے، مذاکرہ بین المذاہب کی کوششیں ہورہی ہیں اور بعض روشن خیال اور مذہب بیزار افراد انسانیت کو سب سے بڑے مذہب کی حیثیت سے متعارف کرانے میں لگے ہوئے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ انسانیت کی خدمت ہی فی الواقع سب سے بڑا مذہب ہے، اور انسانیت کی بنیاد پر مختلف مذاہب کے ماننے والے افراد کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جاسکتا ہے۔اس ضمن میں بعض افراد حلف الفضول کے اس تاریخی واقعے کو بھی بطور دلیل کے پیش کرتے ہیں جس میں اللہ کے رسولؐ نبوت سے قبل شریک ہوئے تھے اور نبوت کے بعد بھی اس طرح کے کسی معاہدے میں شرکت کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ دین کو بالائے طاق رکھ کر صرف انسانیت کی خدمت بھی ان کی نجات اخروی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔گویا وہ دین اور انسانیت کو دو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر کے ایک کو دوسرے سے جدا حیثیت عطا کردیتے ہیں۔حالانکہ مذاہب کی تاریخ اور ان کی بنیادی تعلیمات کا جائزہ لیا جائے تو تقریبا دنیا کے تمام مروجہ ادیان میں انسانیت کی تعلیم قدر مشترک نظر آتی ہے۔ظالم کی گرفت، مظلوم کی دادرسی، جھوٹ سے نفرت، صدق ووفا سے محبت، عدل وانصاف کا قیام، مکر وفریب، بدعہدی وبدکلامی سے دوری، حقوق کی ادائیگی، بڑوں کا احترام، چھوٹوں سے شفقت ومحبت، والدین، رشتہ دار اور دینی ومذہبی پیشوا کے ساتھ حسن سلوک وغیرہ یہ وہ انسانی تعلیمات ہیں جن کا علمبردار دنیا کا ہر مذہب رہا ہے۔البتہ اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ پیغمبر آخر نبی کریمؐ نے اپنی بعثت کا مقصد ہی ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ ''مجھے مکارم حسنہ کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہے''۔اور قرآن کریم میں آپ کی ذات مقدسہ کی تصویر کشی یوں کی گئی ہیں: ''ہم نے آپ کو سارے عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے''۔دوسرے الفاظ میں اس کی تفسیر یوں ہے کہ اسلام نے انسانیت کی تکمیل کی ہے اور اس کی تعلیمات انسانیت کا اعلیٰ ترین مظہر ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص جو انسانیت کا علمبردار ہے، انسانی فلاح وبہبود اور رفاہ عامہ کے کاموں کے لئے اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے ہے۔وہ اللہ کی وحدانیت کا بھی قائل ہے، لیکن نبی کریمؐ کی رسالت کو تسلیم نہیں کرتا۔کیا انسانی فلاح وبہبود اور رفاہ عامہ کے یہ کام اس کے لئے نفع بخش ثابت ہوں گے، اور اس کی نجات اخروی کا ذریعہ بن سکیں گے؟ یا اسلام ہی اخروی نجات کا واحد سہارا ہے، اور اسلام کے بغیر اخروی نجات کی آرزو محض خام خیالی اور اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔مقالہ ہذا میں اسی پہلو کو اجاگر کرنے اور اسلام کے مقابلہ میں دیگر ادیان کی حیثیت واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سورہ بقرہ آیت ۶۲ اور مائدہ ۶۹۔۔۔۔۔کے حوالے سے بعض اہل مغرب نے یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اخروی نجات کے لئے اللہ کے رسولؐ پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔اس لئے کہ آیت مذکورہ میں اس بات کی صراحت ہے کہ اہل ایمان، یہود، نصاری اور صابئین میں سے جو شخص بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لے آئے اور عمل صالح کرے وہ اس کی اخروی نجات کے لئے کافی ہوگا۔مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے ان کی اس غلط فہمی کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس زمانہ کے بعض متکلمین اور منکرینِ سنت اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جو اہل کتاب اپنے اپنے صحیفوں کی تعلیمات پر نیک نیتی کے ساتھ عمل کر رہے ہیں، قرآن مجید ان کی نجات کے لئے رسولؐ پر ایمان لانا ضروری نہیں ٹھہراتا۔ان کے خیال میں ایسے اہل کتاب کی نجات کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے اپنے صحیفوں اور نبیوں کی تعلیم پر نیک نیتی کے ساتھ عمل کریں۔ان لوگوں نے اپنے اس خیال کی تائید میں جن چیزوں سے استدلال کیا ہے ان میں بقرہ کی یہ آیت (۶۲) بھی شامل ہے''۔

آگے نجات کے لئے ضروری چیزوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نجات کے لئے جس طرح دوسروں کے لئے نبی کریمؐ پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح اہل کتاب کے لئے بھی ضروری ہے۔ اور اس معاملہ میں قرآن مجید نے اچھے اہل کتاب اور برے اہل کتاب میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔۔۔۔ اگر اہل کتاب کے صالح لوگوں کی قرآن کریم نے جگہ جگہ تعریف کی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کی یہ نیکی ان کی نجات کے لئے کافی تھی، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا رویہ ان کی حق پسندی کے سبب سے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اچھا تھا۔ اور اس قسم کے سارے لوگ آہستہ آہستہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے''۔

حافظ محمد ادریس کاندھلویؒ نے مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

''آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ فقط اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانا نجات کے لئے کافی ہے، انبیاء اور ملائکہ وغیرہ پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ قرآن کریم کی صاف نصوص اس بات پر صراحتہ دال ہیں کہ جو شخص انبیاء اور ملائکہ کا انکار کرے وہ قطعا کافر ہے۔۔۔۔ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانا اس وقت تک ممکن نہیں کہ جب تک انبیاء، ملائکہ اور صحف سماویہ پر ایمان نہ لائے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور آخرت کے احوال کی معرفت کا ذریعہ انبیاء اور صحف الٰہیہ ہی ہیں اور وحی وصحیفۂ ربانی کا نزول فرشتہ کی وساطت سے ہوتا ہے''۔

مذکورہ تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ اہل مغرب اور موجودہ دور کے متکلمین اور منکرینِ سنت نے آیت مذکورہ سے جس مقصود ومنشا کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، خود آیت کریمہ ہی سے اس کی نفی ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی اس کے علاوہ اور بہت سی ایسی آیات ہیں جن میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ نجات کے لئے اسلام ہی واحد راستہ ہے۔ ذیل میں اسلام کی حقیقت اور اس کے بالمقابل دیگر ادیان کی حیثیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے یہ بات مبرہن ہو جائے گی کہ جو لوگ اسلام کے علاوہ کہیں اور راہِ نجات کی تلاش میں ہیں وہ سخت گمرہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ نجات کے لئے ایمان اور عمل صالح ضروری ہے، اور عمل صالح کا ایک لازمی عنصر تو خود ایمان ہی ہے۔ بغیر تصحیح ایمان کے کوئی عمل، عملِ صالح کی تعریف میں آ ہی نہیں سکتا۔

اسلام ایک آفاقی مذہب ہے وہ انسانی معاشرہ کے لیے ضابطۂ حیات فراہم کرتا ہے اور پوری انسانی زندگی کو حکم الٰہی کے تابع بنا دینے کی تاکید کرتا ہے، ایک خدا کی بندگی اور زندگی کے تمام دائروں میں اس کی بے لاگ اطاعت یہی چیز اس کی جملہ تعلیمات کا مغز اور جوہر ہے، اس کا مطالبہ ہے کہ جسے بھی اس قافلہ میں شامل ہونا ہے وہ بہ ہمہ وجوہ شامل ہو اور اپنے جملہ معاملاتِ زندگی میں اس کی لائی ہوئی شریعت اور اس کے عطا کردہ احکام کی دل وجان سے پیروی اختیار کریں، اس سے ہٹ کر کسی دوسرے راستے کی پیروی، شیطان کی پیروی ہے جو انسان کو ضلالت وگمرہی کی طرف لے جاتی ہے، فرمان خداوندی ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ، فَإِن زَلَلْتُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (بقرہ: ۲۰۸-۲۰۹)!

اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، اب اگر تم پھسلتے ہو جب کہ تمہارے پاس (جملہ معاملات زندگی سے متعلق) واضح تعلیمات آچکی ہیں تو جان لو کہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

قرآن کریم نے بار بار اس بات کی تاکید کی ہے کہ اس کے عطا کردہ پورے مجموعہ قانون اور اس سے ابھرنے والی پوری شریعت کی پیروی میں انسان کی نجات مضمر ہے، آخری شریعت کے آجانے کے بعد دوسرے تمام طریقے منسوخ ہو چکے ہیں۔ صداقت سے عاری محض خواہشاتِ نفس کے مظہر ان طریقوں کی جو لوگ اتباع کریں گے دنیا میں نہ سہی تو آخرت میں وہ کسی صورت خدا کی گرفت سے نہ بچ سکیں گے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّهُمْ لَن يُغْنُوا عَنكَ۔ پھر اے نبی! ہم نے تمہیں ایک مستقل ضابطہ دین پر قائم کیا ہے تو تم (پوری پوری) اس کی پیروی کرو، اور ان لوگوں کی خواہشات

مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَإِنَّ الظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ

کی پیروی نہ کرو جو نہیں جانتے، اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں وہ تمہارا کچھ بھلا نہ کر سکیں گے، اور یہ بے انصاف ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو اس کا ڈر رکھتے ہیں۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی جانے والی یہ وحی یعنی قرآن اور آپؐ ملنے والی یہ شریعت ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس کے اندر انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی کے جملہ امور ومسائل کے سلسلے میں تفصیلی ہدایات فراہم کی گئی ہیں، زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے مسئلے سے لے کر انسان کے اخلاق، تمدن، معاشرے، معیشت، سیاست، حکومت وغیرہ جملہ معاملات زندگی کے سلسلے میں اس کتاب عزیز کے اندر اصولی طور پر واضح ہدایات دی گئی ہیں، اس نے اپنی خصوصیت ہی یہ بیان کی ہے کہ وہ علی الاطلاق کتاب ہدایت ''ھدی للناس'' روشنی، نور اور حق وباطل کے درمیان فیصلہ کن چیز ہے۔

قرآن کریم نے متعدد آیات میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ سلسلۂ نبوت کے آغاز سے لے کر خاتم الانبیاء حضرت محمدؐ تک تمام انبیاء کرام کا دین ایک ہی رہا ہے، اور یہی وہ دین ہے جسے ہر نبی کو قائم رکھنے کی تلقین کی گئی ہے، ارشاد خداوندی ہے:

مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ (شوریٰ: ۱۳)

اس نے تمہارے لیے وہ دین ٹھہرایا جس کی اس نے تاکید کی نوح کو، اور جس کی ہم نے وحی کی تم کو اور جس کی ہم نے تاکید کی ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو اور وہ یہ کہ تم سب دین کو قائم رکھو اور اس کے معاملہ میں ٹکڑیوں میں نہ بٹو، مشرکوں کے لیے وہ چیز بڑی بھاری ہے جس کی طرف تم انھیں بلاتے ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے بنیادی مخاطبین مشرکین عرب، یہود ونصاریٰ کے سامنے بار بار اس بات کا اعلان بھی کیا ہے کہ میں تمہیں کسی نئے دین کے اتباع کی دعوت نہیں دے رہا ہوں، بلکہ یہ درحقیقت وہی دین ہے جس کی دعوت تمہارے جد امجد ابراہیمؑ نے دی تھی، یہ حقیقت واضح رہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت قرآن کے ان تینوں بنیادی مخاطبین کے نزدیک مسلم تھی اور وہ سب اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کا پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور اس پر انھیں یک گونہ فخر بھی تھا، آپؐ کو اس بات کے اعلان کا حکم ہوا کہ: قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (انعام: ۱۶۱)

کہو کہ میرے رب نے مجھے سیدھے راستہ پر لگایا ہے ٹھیک دین ابراہیم کا طریقہ جو

یکسوتھااورشرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔

صراط مستقیم اور ملت ابراہیم کی حقیقت واضح کرنے کے بعد قرآن کریم نے اہل کتاب کی برمحل گرفت کی ہے اوران کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے، یہود ونصاریٰ نے ملت ابراہیمی کو پوری طرح پامال کرر کھا تھااور جس چیز کی انھیں دعوت دی گئی تھی، اس میں بھی وہ تحریف کے مرتکب ہوئے تھے، چنانچہ یہود حضرت عیسیٰؑ اوران کی لائی ہوئی کتاب انجیل کے منکر تھے اور نصاری حضرت موسیٰؑ اور توراۃ کے ماننے سے انکار کرتے تھے اور ہر ایک اپنے سلسلے میں اس خوش گمانی کا شکار تھا کہ تنہا اسے ہدایت کا سرٹیفکیٹ حاصل ہے اور راہ یاب ہونے اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کی جماعت میں شامل ہونا ضروری ہے، قرآن نے ان کے اس عقیدہ باطل کی تردید کی اور صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ جب تک یہ دونوں ہی لوگ پورے سلسلہ نبوت اور خدا کی اتاری ہوئی تمام آسمانی کتابوں کا اقرار کر کے اپنے تمام گروہی اور قومی تعصّبات کا رنگ اتار کر صرف خدائی رنگ میں اپنے کو رنگ نہیں لیتے ان کا دعوائے ایمان واسلام بالکل باطل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَقَالُواْ کُونُواْ هُوداً أَوْ نَصَارَی تَهْتَدُواْ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ قُولُواْ آمَنَّا بِاللّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالأسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لاَ نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ فَإِنْ آمَنُواْ بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ

اورانھوں نے (اہل کتاب) نے کہا کہ تم یہودی یا نصرانی ہوجاؤ تو صحیح راستہ پر ہوگے، کہو (انھیں) بلکہ ابراہیم کا طریقہ برحق ہے جو یکسو تھا اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا، کہو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس چیز پر جو اتاری گئی ہم تک اور جو اتاری گئی ابراہیم و اسماعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور اولاد یعقوب پر اور جو دی گئی موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو دی گئی دوسرے تمام نبیوں کو

دوسری جگہ فرمایا گیا کہ اللہ، رسول، کتاب (قرآن مجید) اور سابقہ رسل اور ان پر نازل کردہ کتابوں پر ایمان ہی درحقیقت اسلام کا راستہ ہے، اس راستہ کو چھوڑ کر دوسرا جو راستہ بھی اپنایا گیا وہ گمرہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ آمِنُواْ بِاللّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَى رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِيَ أَنزَلَ مِن قَبْلُ وَمَن يَكْفُرْ بِاللّهِ وَمَلاَئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلاَلاً بَعِيداً (سورہ نساء: ۱۳۶)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ٹھیک طرح سے ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس نے اس سے پہلے اتاری اور جو کوئی انکار کرے اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور آخرت کے دن کا تو وہ دور کی گمرہی میں جا پڑے۔

جہاں تک شرک وبت پرستی کا تعلق ہے تو ان کی ضلالت و گمرہی واضح ہے، ان کا دین ابراہیم اور ملت ابراہیمی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے اس لیے کہ اس تصور کی بنیاد ہی یہی ہے کہ اس کائنات کے اندر ایک نہیں بلکہ بہت سے خداؤں کی کارفرمائی ہے، چنانچہ اس کا ہر گروہ اپنی پسند کے کچھ بت رکھتا ہے، انھیں سے وہ ڈرتا اور انھیں سے لو لگاتا ہے اور اپنی زندگی میں جو کچھ کرتا ہے انھیں معبودان باطل کی خوشی یا ناخوشی کے جذبہ سے کرتا ہے، اپنی پوری زندگی میں من مانے طریقوں پر عمل پیرا ہوتا ہے اور پوری ڈھٹائی سے اس خود ساختہ پوری شریعت کو اپنے انہیں معبودوں کے کھاتے میں ڈال دیتا ہے، ہر گروہ بس اپنے آپ میں مگن ہوتا ہے کہ اس نے جو راستہ اپنا رکھا ہے وہی سب سے اچھا اور عمدہ راستہ ہے، اور بقیہ دوسرے تمام لوگ بے راہ رو اور ادھر اُدھر کے ٹھوکریں کھانے والے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ ان کا ہر گروہ گمرہی میں ایک دوسرے سے بڑھا ہوا اور جادۂ مستقیم سے بہت دور ہوتا ہے، یہی وجہ ہے جو قرآن نے اپنے ماننے والوں کو اہل کتاب یہود ونصاری کے تفریق دین کے طریقہ سے اجتناب کی تلقین کے ساتھ اہل شرک کی اس روش سے بھی اسی طرح اجتناب کی تلقین کی ہے، اس وضاحت کے ساتھ کہ اس نے جس دین کا راستہ دکھایا ہے وہ اللہ کی بتائی ہوئی فطرت سے عین ہم آہنگ ہے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفاً فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعاً كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (روم: ۳۰-۳۲)

سوتم اپنے رخ کو سیدھا کرلو دین کے لیے یکسو ہو کر، یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی فطرت ہے، جس پر اس نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے، اس کی بناوٹ میں کوئی تبدیلی نہیں، یہی سیدھا راستہ ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اس کی طرف جھکے ہوئے رہو اور اس سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور شرک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔ ان لوگوں میں سے جنھوں نے اپنے دین کے حصے بکھرے کیے، اور ٹکڑیوں میں بٹ گئے، جبکہ ہر جتھا اس پر خوب مگن ہے جو اس کے پاس ہے۔

یہی دین حنیف از آدم تا خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کا دین رہا ہے، جب جب بھی اس میں کجی پیدا ہوئی اللہ نے اسے دور کرنے کے لیے انبیاء کرام مبعوث کیے، جو وقفہ وقفہ سے اس دنیا میں آکر لوگوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے، بعد کے ادوار میں خاص طور پر اہل کتاب یہود ونصاری کے یہاں آپسی بغض وحسد اور باہمی آویزشوں اور چپقلشوں کے نتیجہ میں یہ اختلاف نسبتاً زیادہ شدت اختیار کر گیا تو اللہ تعالیٰ نے آخری نبی کے ذریعہ طالبین حق کے لیے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے سے نکلنے کا سامان کیا، اور قیامت تک کے لیے تنہا یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر آدمی ازل میں دکھائے ہوئے اللہ تعالیٰ کے سیدھے راستے پر گامزن ہوسکتا ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ تمام لوگ ایک طریقے پر تھے سو اللہ نے اپنے بندوں کو بھیجا خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والے بنا کر

لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُواْ فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلاَّ الَّذِينَ أُوتُوهُ مِن بَعْدِ مَا جَاءتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْياً بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّهُ الَّذِينَ آمَنُواْ لِمَا اخْتَلَفُواْ فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللّهُ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (بقرہ: ۲۱۳)

اور اس کے ساتھ کتاب کو اتارا حق کے ساتھ تاکہ وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے اس معاملہ میں جس میں وہ جھگڑ پڑے ہیں اور اب جو اس میں جھگڑے میں وہ جنھیں وہ کتاب دی گئی اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی نشانیاں آئیں، آپس کی عداوت اور دشمنی کی بنا پر، تو وہ حق جس کے معاملے میں ان لوگوں کا جھگڑا تھا اللہ نے اس کے سلسلے میں اپنے حکم سے ان لوگوں کو سیدھی راہ دکھادی، جو آج ایمان لائے، پس اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

ایک دوسرے مقام پر قرآن کریم میں اس بات کی صراحت ہے کہ اگر پہلے سے اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا کہ دنیا میں قبولِ حق کے لیے انسانوں کو ایک خاص مدت تک مہلت دی جاتی رہے گی تو ان کے اس شرک کی بنا پر ان کا کام تمام کر دیا جاتا۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلاَّ أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُواْ وَلَوْلاَ كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (یونس:۱۹)

اور تمام لوگ جو تھے بس ایک راستہ پر تھے پھر ان کے جھگڑے شروع ہوئے اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات (مہلت دئے جانے کی) نہ گزر چکی ہوتی تو اس کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا، اس معاملہ میں جس میں کہ یہ جھگڑتے ہیں۔

دین اسلام کا یہی وہ بنیادی پیغام تھا جسے دنیا میں ہر رسول بلا استثناء اپنی اپنی قوم تک پہنچاتا رہا، یہ الگ بات ہے کہ اپنی بدقسمتی سے لوگوں نے حق کی اس سیدھی اور سچی شاہ راہ کو چھوڑ کر انحراف کی صورتیں اپنائیں اور مختلف پگڈنڈیاں نکال لیں، قرآن نے ان الفاظ میں ان کو انذار کیا ہے، آخر میں سب ہماری ہی طرف پلٹنے والے ہیں اس وقت انھیں ان کے شامت اعمال سے باخبر کیا جائے گا۔

إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ كُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ (انبیاء: ۹۲-۹۳)

ضرور یہ تمہاری امت ہے ایک طریقہ کی اور میں تمہارا رب ہوں سو تم میری بندگی کرو، لیکن انھوں نے اپنے معاملہ کو ٹکڑے کر ڈالا، حالاں کہ سب ہم تک پلٹنے والے ہیں۔

قرآن کریم نے اس بات کی بھی صراحت کر دی ہے کہ نبی آخر الزماں کے آجانے کے بعد سلسلۂ نبوت اب ختم ہو چکا اب آپ ؐ کا لایا ہوا دین اپنی تکمیلی شریعت کے ساتھ خدائی تعلیمات کا آخری ایڈیشن ہے جس نے گزشتہ تمام شریعتوں کو منسوخ کر دیا ہے، قرآن کریم کا اعلان عام ہے کہ:

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلاَمَ دِيناً (مائدہ:۳۰)

آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے دین کی نسبت سے اسلام کو پسند کیا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللّهِ الإِسْلاَمُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوْتُواْ الْكِتَابَ إِلاَّ مِن بَعْدِ مَا جَاءهُمُ الْعِلْمُ بَغْياً بَيْنَهُمْ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللّهِ فَإِنَّ اللّهِ سَرِيعُ الْحِسَابِ (آل عمران:۱۹)

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے اور اہل کتاب نے اختلاف نہیں کیا مگر بعد اس کے کہ ان کے پاس جانکاری آچکی تھی، آپس کی دشمنی اور عداوت کی بنا پر اور جو کوئی اللہ کی آیتوں کا انکار کرے تو معلوم ہو کہ اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔

قرآن کریم نے اس حقیقت کو دوٹوک انداز میں بیان کر دیا ہے کہ اسلام کی آمد کے بعد اہل کتاب یہود و نصاریٰ کی نجات بھی اب اسی اسلام سے وابستہ ہے، ان کے لیے بھی راہِ نجات صرف اور صرف یہی ہے کہ وہ اس کی دکھائی ہوئی روشنی پر عمل پیرا ہوں اور اس آخری شریعت کو بتمام وکمال اپنالیں جو کہ قرآن کریم کے صفحات میں موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيراً مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ قَدْ جَاءكُم مِّنَ اللّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ (مائدہ: ۱۵-۱۶)

اے اہل کتاب! تمہارے پاس میرا رسول آگیا ہے جو تمہارے لیے کھول رہا ہے ان بہت سی چیزوں کو جو تم کتاب کی چھپاتے تھے اور بہت سے صرف نظر کرتا ہے، تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور کھلی ہوئی کتاب آگئی ہے، اس کے ذریعہ اللہ سمجھاتا ہے جو اس کی خوشنودی کی پیروی کریں سلامتی کے راستوں کو اور انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے، اپنے حکم سے اور ان کی ٹھیک راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

اسی طرح سورہ مائدہ میں پوری انسانیت کو خطاب کر کے آپ کو اس اعلان کا حکم ہوا کہ اب قیامت تک کے لیے تمام انسانوں کی نجات اس سے وابستہ ہے کہ وہ اس آخری رسول پر ایمان لائیں اور کسی تحفظ اور چوں چرا کے بغیر جملہ معاملات زندگی میں اس کی اطاعت و پیروی کو اپنے لیے لازم پکڑ لیں۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعاً الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ لا إِلَـهَ إِلاَّ هُوَ يُحْيِـي وَيُمِيتُ فَآمِنُواْ بِاللّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (اعراف:۱۵۸)

کہو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں جس کے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں، وہ جلاتا اور مارتا ہے، سو تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول، اس کے نبی پر جو ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور اس کی باتوں پر اور اس کی پوری طرح پیروی کرو امید کہ تم راہ یاب ہو۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ اسلام کے مقابلہ میں سابقہ ادیان کی حیثیت منسوخ مذاہب کی ہے جو اپنے وقت کے انبیاء کے زمانے تک خاص تھی، ہر نبی کے ذریعہ ان سے پہلی قوم کے اندر رائج شریعت میں تبدیلی کی گئی ہے۔ اور آخری نبی کی آمد نے اپنے سے پہلے کے تمام ادیان کو منسوخ کر دیا۔ قرآن کریم سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ دین اپنے مجموعی لحاظ سے تمام انبیاء کے درمیان مشترک رہا ہے جیسا کہ آیت کریمہ ''شرع لکم من الدین ......'' الآیۃ میں بیان کیا گیا ہے، البتہ شریعت میں جزوی ترمیم ہوتی رہی ہے، اسلام سے پہلے کے سابقہ تمام آسمانی مذاہب میں توحید، نبوت اور معاد کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے اور تقریباً ہر نبی نے اپنی قوم کو ایک رب وحدہ لاشریک لہ کی عبادت و پرستش کی دعوت دی ہے، اختلافات بعد کی پیداوار ہیں، جیسا کہ متعدد آیات کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے، اور اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ اسلام کی آمد کے بعد گزشتہ رسالتوں کا دور ختم ہو چکا اور اب کفار و مشرکین اور اہل کتاب، یہود و نصاریٰ کی نجات کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اس نبی آخر الزماں کی رسالت کو تسلیم کر لیں اور اس کی لائی ہوئی کتاب کے مطابق اپنی زندگی بسر کریں، اسی میں ان کی دنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے یہاں کسی کو کوئی درجہ و مرتبہ کسی گروہ کے ساتھ نسبت کی بنا پر حاصل نہیں ہوتا، بلکہ ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور عمل صالح کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔ اگر یہ چیزیں حاصل نہ ہوں تو ہر چند کوئی شخص مسلمانوں ہی کے گروہ سے وابستہ ہونے کا مدعی ہو، خدا کے یہاں اس کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

فرد کی تعمیر میں والدین اور سماج کا کردار

امتیاز احمد
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ایک نومولود بچے کے دل میں والدین کے تئیں محبت ایک فطری امر ہے، پیدائش کے ابتدائی زمانوں میں اس کا تعلق صرف والدین سے ہوتا ہے، انہیں کی گود میں سوتا ہے، روتا ہے اور انہیں سے چمٹا رہتا ہے، ماں باپ اس بچے کی پرورش اور اس کی دیکھ بھال میں اپنا سکون و آرام قربان کرتے ہیں جس سے ان کو غیر معمولی خوشی اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا ہے تو لاشعوری طور پر یہ نومولود بچہ اپنے بھائی، بہن اور گھر کے دیگر افراد کے ساتھ ساتھ دوسرے رشتہ داروں اور پاس پڑوس والوں کو پہنچان جاتا ہے ان کی طرف لپکتا ہے، ان کی گود میں کھیلتا ہے انہیں دیکھ کر مسکراتا ہے اور چند منٹوں کے لئے اپنے ماں باپ سے جدائی اس کو نہیں رلاتی۔

غرض ایک بچے کی پرورش و پرداخت اور اسے شعوری زندگی تک پہنچانے میں صرف اس کے والدین کا ہی رول نہیں ہوتا ہے، بلکہ خدائے پاک و برتر ان کے علاوہ دیگر افراد کے دل میں اس بچے کے تئیں محبت ڈالتا ہے جو اسے اپنی گود میں لے کر، اسے کھلا کر مسرور اور خوش ہوتے ہیں اور سماج کے ایک فرد کی حیثیت سے انہیں متعارف کرانے میں گھر والوں کے معاون ہوتے ہیں اگر سماجیات کی زبان میں کہا جائے تو اس بچے کے سماجی کرن (Socialization) میں ان تمام افراد کا کردار ہوتا ہے۔

صالح اور شریف النفس اولاد صرف اپنے والدین اور گھر والوں کے لئے ہی باعث مسرت نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک اچھے پڑوسی، قابل اعتماد دوست، پاک طینت رشتے دار بھی ہوتے ہیں اور سماج میں باوقار اور سلیم الفطرت انسان کی حیثیت سے انہیں نمایاں مقام دیا جاتا ہے اس طرح وہ انسانی سماج کے لئے رحمت ہوتے ہیں جن کی کوششوں سے نیکیاں فروغ پاتی ہیں اور برائی وفساد کا خاتمہ ہوتا ہے۔

اس کے برخلاف بدکردار اور شریر النفس اولاد نہ صرف یہ کہ اپنے اہل خانہ کے لئے بدنامی اور رسوائی کا باعث ہوتے ہیں بلکہ وہ جھگڑالو پڑوسی نا قابل اعتبار دوست اور بدمزاج رشتے دار بھی ہوتے ہیں جن کو سماج میں ایسے لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے جو برائیوں کا ارتکاب کرتے اور اسے فروغ دیتے ہیں غرض یہ کہ فرد کی سیرت و کردار کی تعمیر اور تخریب میں اہل خانہ اور سماج دونوں کا بہت اہم کردار ہوتا ہے اور ان دونوں میں اگر موازنہ کر کے دیکھیں تو گھر والوں کا رول کلیدی معلوم ہوتا ہے۔

اس مضمون میں راقم نے گھر (Family) اور باہر کے لوگ یعنی سماج کے مابین انقطاع گفتگو (Communication Gap) یا ان دونوں کے درمیان رشتوں کی نا ہمواری کے نتیجے میں مسلم بچوں کے اخلاق و کردار پر جو اثرات مرتب کیے ہیں اور اس درمیان والدین کا عموماً طرز عمل کیسا ہوتا ہے اس حوالے سے گفتگو کی ہے۔

یہ ایک نا قابل فراموش حقیقت ہے کہ فطرت انسانی تنہائی پسند نہیں ہے اجتماعیت اس کے خمیر میں ہے لوگوں سے ملنا ان سے مختلف نوعیت کے تعلقات استوار کرنا اس کی جسمانی اور ذہنی تعمیر کے لئے ضروری ہے جس سے محروم رہ کر وہ انسانی صفات سے خود کو متصف نہیں کر سکتا انہیں تعلقات اور میل جول کے نتیجے میں وہ بہت سے چیزیں لوگوں سے سیکھتا ہے اور سماج کے افراد بھی بہت سی چیزیں اس سے سیکھتے ہیں یعنی علم سماجیات کے دو بڑے نظریات کے برخلاف جس میں سے ایک کا کہنا ہے کہ فرد کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے سب کچھ سماج ہے اور فرد نہ صرف یہ کہ سماج کا اثر قبول کرتا ہے بلکہ سماج جس طرح اور جیسے چاہتا ہے فرد کی شخصی تعمیر ویسے ہی ہوتی ہے۔ جب کہ دوسرے نظریہ کے مطابق فرد کی شخصی تعمیر میں سماج کا کوئی رول نہیں ہوتا ہے چونکہ فرد عقل وشعور رکھتا ہے اور اپنے بھلے اور برے کا اسے بخوبی علم ہوتا ہے اس لئے اپنے اخلاق و کردار کی تعمیر اور تخریب میں وہ سماج کو ذمہ دار نہیں ٹھہراتا یہ دونوں نظریات افراط وتفریط پر مبنی ہیں۔

ان دونوں افکار کے برعکس یہ بات زیادہ قابل قبول ہے کہ فرد کے افکار واعمال پر سماجی تبدیلیوں کا اثر ہوتا ہے اور ایک فرد اس قابل ہوتا ہے کہ وہ سماج کو متاثر کر سکتا ہے لوگ اس کی سوچ وفکر اور اس کے اخلاق و کردار کی روشنی میں اپنی شخصیت کی تعمیر کر سکتے ہیں اور کرتے بھی ہیں یعنی فرد متاثر ہوتا بھی ہے اور متاثر کرتا بھی ہے۔

اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے غور کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسانی دنیا میں جو بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں مثلاً صنعتی انقلاب، فرانس کا انقلاب اور بہت سے دیگر نظریات و مباحث مثلاً جدیدیت، مابعد جدیدیت، تحریک حقوق نسواں، لبرل ازم اور کمیونیٹر یزم وغیرہ نے انسانی زندگی پر غیر معمولی اثرات مرتب کئے ہیں اور انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس پر اس کے اثرات نہ پڑے ہوں۔ ان تحریکات اور افکار کے نتیجے میں انسانوں نے علمی اور مادی اعتبار سے تو خوب ترقی کی مگر انسانی روح فاقہ زدہ ہوگئی، رشتے اور تعلقات نہ صرف یہ کہ کمزور ہوگئے بلکہ بہت سے پاکیزہ رشتے اور سماجی ادارے (Social Institutions) جو اخلاق و کردار کی تعمیر میں معاون ہوا کرتے تھے اور برائیوں کا ارتکاب کرتے وقت سماجی رکاوٹ (Social Control) کا کام انجام دیتے تھے ان کے وجود اور جواز پر ہی حملہ کر ڈالا ہے اور بات یہاں تک پہنچ گئی ہے

کہ انسان کی ''اخلاقی ذمہ داری'' نام کی کوئی چیز بھی ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر ہمارے سماج میں چند سالوں قبل تک لوگوں کا اخلاق کچھ ایسا تھا کہ جب کوئی شخص کسی بچے کو کوئی غلط کام کرتے پاتا تو وہ اسے اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھتا کہ اسے منع کرے اور اگر ضرورت پڑے تو اس کے ساتھ سخت رویہ اپنائے یہاں تک کہ ایک محلے یا گاؤں کا کوئی فرد اپنے محلے یا گاؤں کے کسی بھی بچے کو جسے وہ جانتا ہو کوئی غلط فعل کا ارتکاب کرتے دیکھتا تو اسے روکنے کی کوشش کرتا اور والدین بھی کوششوں کو سراہتے اور اظہار تشکر کرتے تھے کہ انہوں نے ان کے بچے کو برائی کی طرف بڑھنے سے روکا ہے اور ساتھ اس بچے کو ملامت اور اس کے ساتھ سخت رویہ اپناتے تاکہ اسے بگڑنے سے بچایا جا سکے۔

مگر اب حالات بالکل بدل گئے ہیں پاس پڑوس اور محلے کے لوگ تو بہت دور کے ہیں اپنے سگے چچا، پھوپھی، دادا، دادی اور اس طرح دوسرے قریبی رشتے دار بھی اگر بچے کو ان کی برائیوں پر ٹوکتے اور منع کرتے ہیں تو والدین اپنے بچے کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب ان کے بچے کے خلاف ہیں اور ان سے دشمنی نکال رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس بچے کے اندر برائی کرنے کا حوصلہ بھی پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بنیادی رشتوں کی پاسداری کا احساس اس کے دل میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ دوسری طرف والدین اپنے بچوں کے اخلاق اور ان کی حرکتوں سے نابلد ان پر عنایات کرتے رہتے ہیں اور صاحبزادے بری عادتوں کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں۔

والدین کے اس رویہ سے سماجی رکاوٹ (Social Control) پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے اب کوئی رشتے دار، پڑوسی اور دیگر لوگ جب کسی کو برے کاموں میں ملوث دیکھتے ہیں تو والدین کا ان کے ساتھ برے اور غیر ذمہ دارانہ سلوک کی وجہ سے خاموشی اختیار کرنے میں ہی اپنی عزت کو محفوظ سمجھتے ہیں اور انہیں برائی سے نہیں روکتے۔ غرض بچوں کے تئیں والدین کا ایسا طرز عمل، جس میں حد سے زیادہ ناز برداری ہو، ان کے غلطیوں پر انہیں تادیب کرنے کے بجائے ان کی حمایت میں کھڑے ہونے سے عموماً بچے بگڑ جاتے ہیں۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ ایک بچہ جو غلط راستہ اختیار کرتا ہے وہ صرف اپنے والدین کا بیٹا ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ سماج کا ایک حصہ بھی ہوتا ہے جس کی بری عادات واطوار سے سماج کے دیگر افراد متاثر ہوتے ہیں۔

انسان جسم اور روح دونوں کا مجموعہ ہے نبی آخر الزماں ؐ نے افراط وتفریط کے مابین بھٹکتی ہوئی انسانیت کو عدل وتوازن کا درس دیا اور آپ ؐ نے ہمیں اس بات کی تعلیم دی ہے کہ جسم اور روح کے درمیان توازن قائم رکھا جائے جس میں ہماری فلاح وکامرانی مضمر ہے، مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ ہم مسلمانوں نے آپ ؐ کی پیاری تعلیمات کو سیکھنا اور اس پر عمل کرنے کو ثانوی حیثیت دے رکھی ہے، ہماری سعی وجہد ان تمام وسائل وذرائع کے حصول میں صرف ہو رہی ہیں جن سے مادی اور جسمانی ضروریات کی تکمیل ہو سکے مگر روحانی پیاس بجھانے اور اس کے تعلق سے اس طرح فکرمندی ظاہر نہیں ہوتی جس طرح دنیوی معاملات میں ہوتی ہے اس سلسلے میں والدین کی ذمہ داریوں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

چونکہ جہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ نے ان کے کچھ حقوق ان کی اولاد پر عائد کئے ہیں وہیں ان پر کچھ فرائض بھی متعین فرمائیں ہیں جنہیں ادا کرنا ضروری ہے ورنہ وہ اللہ کے غضب سے بچ نہیں سکتے ہیں۔

ان حقوق وفرائض کے ذریعہ اللہ تعالیٰ پاکیزہ سماج کی تعمیر وتشکیل کرنا چاہتا ہے جہاں آسانی کے ساتھ اچھائیاں فروغ پا سکیں اور برائیوں کا ارتکاب مشکل سے مشکل تر ہو جائے۔ مگر اس میں بھی افراط وتفریط کے ہم شکار ہو گئے۔ حقوق تو یاد رہے لیکن فرائض کو فراموش کر چکے ہیں اور اگر والدین کو اپنے فرائض کا کچھ بھی ادراک ہے تو صرف اس حد تک کہ اپنے اولاد کو اس قابل بنا دیا جائے جس سے وہ دنیا میں آرام وسکون کی زندگی گزار سکیں اور جن سے وہ اپنے جسمانی لذتوں اور ضروریات کے سامان بہم پہنچا سکیں، مگر بچوں کی آخرت بنانے، ان کے دلوں میں اللہ اور رسول کی محبت پیدا کرنے ان کی تعلیمات پر عمل کر کے روحانی پیاس بجھانے کے تعلق سے ان پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں جو کہ حقیقی فرائض ہیں، اس کے تئیں یکسر غفلت اور سرد مہری کا رویہ عموماً والدین نے اپنا رکھا ہے نتیجتاً نئی نسل بے راہ روی اور مادہ پرستی کا شکار ہے اور انسانی سماج کو مکدر کرنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں۔

والدین کے اس طرز عمل کے پیچھے بہت سارے عوامل کارفرما ہیں جہاں ایک طرف ترجیحات کا غلط تعین ہے وہیں ''اسلاموفوبیا'' کا اثر بھی بہت غالب ہے۔ مغرب اور اس کے حواریین نے بالخصوص ۱۱/۹ کے بعد اسلام اور مسلمانوں کی ایسی خوف ناک تصویر پیش کی جس سے اسلام اور مسلمانوں کا نام آتے ہی دوسرے مذاہب کے پیروکاروں میں خوف و دہشت جیسی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اس طرح کے تصور نہ صرف یہ کہ غیر مسلم ذہنوں میں پائے جاتے ہیں بلکہ بہت سے مسلم ذہنوں پر بھی اس کے غیر معمولی اثرات پڑے ہیں مثال کے طور پر راقم کا ذاتی مشاہدہ ہے کہ اگر بچہ لہو ولعب اور دوسرے غیر اخلاقی طور طریقوں کا عادی ہے تو والدین اتنی زیادہ ذہنی پریشانی محسوس نہیں کرتے ہیں جتنا کہ اس وقت جب کہ لڑکا نمازوں کی پابندی اور قرآن سے شغف اور اس طرح کے دوسرے دینی کاموں میں دلچسپی لینے لگتا ہے ایسے وقت میں ان کے ذہنوں میں بہت سارے سوالات ابھرنے لگتے ہیں مثلاً آخر اس کے اندر اس طرح کی تبدیلی کیونکر واقع ہوئی؟ اس کا کیریئر تو برباد نہیں ہو رہا ہے؟ یا ایسے لوگوں کی صحبت میں تو نہیں ہے جو سماج کی نظر میں متشدد ہیں؟ ان کے ذہنوں میں اس طرح کے سوالات اس لئے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ دشمنان اسلام نے مسلم نوجوانوں کی تصویر کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ایک مسلم نوجوان اگر بددیانت اور عیاش ہے تو ملک کے لئے نقصان دہ نہیں ہے لیکن اگر وہی نوجوان اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والا بن جائے تو ملک کی سلامتی کے لئے خطرہ بن جاتا ہے، لہٰذا والدین عموماً بچوں میں اس طرح کی تبدیلی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے ہیں۔

مضمون کے ابتداء میں اس بات کا تذکرہ کیا گیا تھا کہ انسان کی پرورش میں صرف والدین کا رول نہیں ہوتا بلکہ دیگر اعزہ واقارب اور پورا سماج مل کر انسان کی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے لہٰذا والدین کی ذمہ داری ہے کہ گھر اور سماج کے درمیان رشتے کو بہتر بنائیں، اگر سماج کا کوئی فرد کسی کے گھر ان کے بچوں کی شکایت لے کر پہنچتا ہے تو الٹا اسے بھی لعنت وملامت نہ کرنے لگیں بلکہ اس فرد کی شکایت کو سنجیدگی سے لیں اور اسے اپنا ہمدرد و بہی خواہ سمجھیں۔

انسان سماجی عوامل سے متاثر ہوتا ہے اور اپنے اخلاق وکردار سے انسانی سماج پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اس بات کی ہدایت کی ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے سماج کو متاثر کرنے کی کوشش کریں تاکہ اچھائیاں فروغ پائیں اور برائیوں کا قلع قمع ہو جائے۔ گھر جس سے انسانی سماج کی ابتداء ہوتی ہے اور والدین اس کے نگراں اور نگہبان ہوتے ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کی عادات واطوار پر گہری نظر رکھیں، ان کی اچھی تعلیم وتربیت کا نظم کریں، انہیں اسلام کا سچا فدا کار اور جانثار بنائیں تابعد وفات ان کے بچوں کی دعائیں انہیں پہنچتی رہیں۔

بلند نصب العین رکھنے کے لئے فرد کو طاقت وقوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک بندۂ مومن کے سامنے خوشنودئ رب اور حصولِ جنت کے اعلیٰ مقاصد ہوتے ہیں۔ مزید وہ اس دنیا میں اللہ کے نائب (خلیفہ) کی حیثیت سے کام کرتا ہے اور کائنات کے بے شمار موجودات اس بندۂ مومن کے لیے مسخر ہوتے ہیں۔ اس لیے اُسے طاقت وقوت والا ہونا چاہیے۔ طاقت وقوت کا تعلق انسان کی صحت سے ہوتا ہے۔ چونکہ انسان کا جسم اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سوال بھی کرے گا۔ انسانی جسم کے بندے پر حقوق ہوتے ہیں جنہیں پورا کرنا نہایت ضروری ہے۔ ان ساری وجوہات کی رو سے جسم و دماغ کو صحت مند رکھنے کے لیے جدوجہد کرنا دین کا تقاضا ہے۔ اللہ کے نبی حضرت محمدؐ نے فرمایا کہ ''اللہ کی نظر میں ایک قوی مومن کمزور مومن سے بہتر ہے اور پسندیدہ ہے۔ (گوان میں سے) ہر ایک میں خیر ہے۔'' (صحیح مسلم، کتاب القدر، جلد پنجم)

ایسے پسندیدہ قوی مومنین میں سے ہی ہمارے انبیاء علیہ السلام تھے۔ حضرت موسیٰؑ ایک وجیہہ انسان تھے اور بھرپور طاقت وقوت رکھتے تھے۔ جس کا مظہر ہمیں قبطی کی موت کے واقعہ میں ملتا ہے۔ موسیٰؑ نے ایک گھونسا مارا اور قبطی وہیں ڈھیر ہوگیا۔ مدین میں حضرت شعیبؑ کی صاحبزادیوں کے جانوروں کو کنویں سے پانی پلانے کے وقت بھی ہمیں یہ طاقت وقوت کا مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ حضرت شعیبؑ کی صاحبزادی نے موسیٰؑ کی سفارش اپنے والد کے پاس یوں کی کہ ''بے شک بہتر نوکر جسے آپ رکھنا چاہیں وہ ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔'' (القصص:۲۶)

آنحضرتؐ کے بارے میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم آپس میں گفتگو کرتے تھے کہ آپؐ کو تیس آدمیوں کی قوت عطا ہوئی ہے۔'' (بخاری، کتاب الغسل)۔ اسی طرح حضرت شموئیل نے جب حضرت طالوت کو بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر کیا اور بنی اسرائیل نے اعتراض کیا تو حضرت شموئیلؑ نے حضرت طالوت کی جو خصوصیات بتائیں وہ ذہنی اور جسمانی قوت ہی تھی فرمایا: ''بے شک اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسی کو (طالوت) کو منتخب کیا ہے اور علمی وجسمانی قوتیں فراوانی کے ساتھ دی ہیں۔ اللہ اپنی سلطنت جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور اللہ وسعت والا اور علم والا ہے۔'' (البقرۃ: ۲۴۷)

اس واقعہ سے یہ بھی استدلال نکلتا ہے کہ امامت وقیادت کا تعلق حسب نسب یا مال سے نہیں بلکہ ذہنی وجسمانی طاقت وقوت سے ہے۔ دراصل ذہنی وجسمانی قوت اور طاقت کا راست تعلق صحت سے ہوتا ہے۔ انسان کا جسم ودماغ صحت مند ہوگا تو پھر طاقت وقوت کے سارے فوائد دیکھنے کو ملیں گے۔ اللہ کے نبیؐ فرماتے ہیں کہ ''صحت وتندرستی اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے دولت سے بھی بہتر ہے۔'' (ابن ماجہ، ابواب البخارہ، مسند احمد) اسی طرح آپؐ نے فرمایا صحت کو غنیمت جانو، بیماری (مرض) سے پہلے۔ (حاکم، شرح السنہ) ایک اور جگہ فرمایا کہ ''دو نعمتیں ایسی ہیں، جن کے بارے میں بہت سے لوگ دھوکے میں پڑے رہتے ہیں اور وہ ہیں صحت اور فرصت۔'' (عن عبداللہ بن عباسؓ، بخاری، کتاب الرقاق، ترمذی، ابواب الزہد) حالتِ صحت میں نیکی وعبادت کا ثواب بھی زیادہ ہے۔ حدیثِ رسولؐ ہے کہ تم اس وقت صدقہ کرو جب تمھیں صحت وتندرستی حاصل ہو۔ (مسلم، بخاری، کتاب الزکوۃ)

صحت وتندرستی:

صحت وتندرستی ہی فرد کو یکسوئی مہیا کرتی ہے۔ اسے بلند مقاصد کے لیے سوچنے پر آمادہ کرتی ہے۔ ورنہ بیمار انسان اپنی بیماری کے باہر سوچ ہی نہیں پاتا۔ صحت وتندرستی اللہ تعالیٰ کی بہترین نعمتوں میں سے ہیں۔

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے

انسان اللہ کا خلیفہ ہے اور مرکب ہے جسم اور روح کا۔ جب انسانی جسم صحت مند ہوگا، مضبوط ہوگا تب ہی وہ روح کے ارتقا کو یقینی بنا سکے گا۔ صحت کی تعریف WHO نے 1946 میں اس طرح بیان کی ہے:

"Health is a state of complete physical, mental & social well being and not merely the absence of disease or infimity". (Premeable to the constitution of WHO 1946)

یعنی صرف جسمانی بیماریوں کا نہ ہونا صحت وتندرستی نہیں ہے۔ بلکہ جسمانی، ذہنی اور سماجی تندرستی بھی ضروری ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر روحانی، نفسیاتی اور جذباتی آسودگی یا تندرستی بھی صحت کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص صحت مند و تندرست رہنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ جسمانی بیماری پیدا کرنے والے عوامل سے دور رہے۔ ذہنی اور نفسیاتی طور سے مضبوط رہے۔ سماجی برائیوں سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ اپنے اخلاق واعمال کو درست رکھے۔ خدا سے تعلق کو مضبوط کرے اور اپنے قلبی احساسات وجذبات کو پاک رکھے۔ تب ہی وہ شخص جسمانی، ذہنی، نفسیاتی، سماجی، روحانی، قلبی و جذباتی تمام پہلوؤں سے تندرست اور مضبوط ہوگا۔

لائف اسٹائل اور صحت:

موجودہ وقت میں امراض کی ایک قسم وہ بیماریاں ہیں جو لائف اسٹائل (طرزِ زندگی) کی خامیوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ جیسے خون کا دباؤ، ذیابیطس (Diabeties)، دل کا دورہ (Heart Attack)، فالج (Stroke)، موٹاپا (Obesity) اور تیزابیت (Acidity) وغیرہ۔ ایک ریسرچ کے مطابق طرزِ زندگی سے جڑی بیماریوں سے لڑنے کے لیے ہندوستان ہر سال 6 Billion$ ڈالر کی رقم خرچ کرتا ہے۔ (ہارورڈ یونیورسٹی اور W H O کی مشترکہ ریسرچ)۔ اسی ریسرچ میں Public Health Foundation of India کے صدر جناب ڈاکٹر کے سری ناتھ ریڈی کے بیان کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''زیادہ تر طرزِ زندگی سے جڑی بیماریوں کی وجہ سے فرد اپنی Productive Age میں متاثر ہوتا ہے۔'' اس لیے طرزِ زندگی کے سلسلے میں جب بھی بات ہوتی ہے، صحت ایک اہم نکتہ ہوتا ہے۔ عام طور پر اخبارات میں طرزِ زندگی (Life Style) کے کالمس میں غیر سنجیدہ اور غیر اہم موضوعات پر بات کی جاتی ہے جیسے کپڑوں، زیورات وغیرہ کے لیے مشورے دیے جاتے ہیں۔ پر ان کالمس کا استعمال صحت کے لیے مشورہ دینے کے لیے کیا جانا چاہیے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ہندوستان اور پوری دنیا میں Life Style Disease اموات کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ 2015 میں IHD یعنی دل کی بیماری کی وجہ سے سب سے زیادہ اموات واقع ہوئی ہیں، ہر دس میں سے ایک فرد کو دل کی بیماری ہے اور ذیابیطس (Diabeties) میں تو ہندوستان دنیا میں سب سے آگے ہے۔ یعنی اسے Diabeties Capital of the World کہتے ہیں۔ ہندوستان کی 31% آبادی موٹاپے کے مرض میں مبتلا ہے، یعنی ہر ۵ میں سے ایک۔ دنیا میں موٹاپے میں ہندوستان کا تیسرا نمبر ہے۔

ہماری طرزِ زندگی (Life Style) میں بہت سی خامیاں، بے اعتدالیاں اور نقائص ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ہماری صحت متاثر ہوتی ہے اور ہمیں Life Style Disorders ہو جاتے ہیں۔ جیسے تعیش پسندانہ طرزِ زندگی، سستی کاہلی، متوازن غذا کا فقدان، Junk Food کا بے پناہ استعمال، ذہنی اضطراب (Stress)، منشیات کا استعمال، طہارت ونظافت کا خیال نہ رکھنا، ان ساری طرزِ زندگی کی خامیوں کی وجہ سے یہ بیماریاں ہوتی ہیں۔ ان سارے عوامل کو ختم کر کے ہم نہ صرف ایک صحت بخت زندگی گزار سکتے ہیں۔ بلکہ صحت کے لیے ہم کچھ وقت نکال کر ایک قوی مومن بن سکتے ہیں۔

صحت مند طرزِ زندگی کے خدوخال

غذا:

غذا کے سلسلے میں قرآن ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ فرمایا: ''اے لوگو! کھاؤ جو کچھ زمین پر حلال اور پاک ہے۔'' (البقرۃ:۱۶۸)

حلال اور طیب اشیاء کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔ اور دنیا کی تمام اشیاء حلال کی گئی ہیں سوائے معدودے چند کے جس کی فہرست اس طرح بیان کی گئی ہے۔ مردار، خون، خنزیر، غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ (البقرۃ:۱۷۳، النحل:۱۱۵) اسی طرح غذا کے سلسلے میں اسراف سے بچنے کی تلقین کی گئی۔ (الاعراف:۳۱) اور غذا جیسی عظیم نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

انگریزی کا ایک مقولہ ہے: .You are what you eat یعنی غذا پر ہی ہماری شخصیت اور ہماری صحت کا دارومدار ہوتا ہے۔ متوازن غذا کی تعریف ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ صحت مند غذا، مناسب وقت پر اور مناسب مقدار میں کھائی جائے تو اسے صحت بخش غذا کہیں گے۔

(۱) **مناسب غذا:** ہماری غذا میں خاص طور پر تین چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ Carbohydrate,fats اور پروٹین اس کے علاوہ غذا کے ذریعہ ہمیں وٹامین، معدنیات اور پانی بھی حاصل ہوتا ہے۔ ہماری غذا میں ایسی چیزیں شامل ہونی چاہیں جو ہمارے جسم کی سبھی ضروریات کو پوری کریں۔ جیسے میٹھی چیزوں میں کاربوہائیڈریٹ زیادہ ہوتا ہے۔ جبکہ گوشت اور دالوں میں پروٹین۔ اسی طرح چربی، تیل اور گھی میں چربی زیادہ ہوتی ہیں۔ اس لیے سبھی قسم کے کھانے ہماری غذا میں شامل ہونی چاہئیں۔ لیکن کسی بھی چیز کی زیادتی نہ ہو۔ کیونکہ ہر چیز کی کمی بھی ہمارے جسم کے لیے نقصان دہ ہے اور اس کی زیادتی بھی۔ ایک عام آدمی کے لیے ہر دن ۱۵۰۰ سے ۳۰۰۰ کلو کیلوری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ کیلوری اگر ہماری غذا میں ہوتی ہے تو وہ جسم میں شکر اور چربی کی صورت میں جمع ہو جاتی ہے۔ جو ہمارے جسم کے لیے نقصاندہ ہے۔ آج کل Junk Food کا رواج چل نکلا ہے جس کی وجہ سے نوجوانوں کی صحت متاثر ہو رہی ہے۔ جنک فوڈ میں دراصل شکر، چربی اور کیلوری کی مقدار زیادہ ہوتی ہے اور پروٹین، معدنیات، بہت کم ہوتی ہیں یا نہیں پائی جاتی۔ جنک فوڈ کے استعمال کی وجہ سے ہی طرزِ زندگی میں ذکر کیے گئے بے شمار بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ سموسہ، برگر، Pizza، پانی پوری وغیرہ وغیرہ یہ سبھی جنک فوڈ ہیں۔ جنک فوڈ ہی کی طرح Cold Drinks بھی ہوتی ہیں۔ جن کا استعمال ہمارے نوجوان فخر کے ساتھ کرتے ہیں پر یہ ہماری صحت کے لیے سمِ قاتل ہے۔

(۲) **مناسب وقت:** کھانے کے وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ پچھلا کھانا ہضم ہونے کے بعد اور بھوک لگنے کے بعد ہی کھانا کھائیں۔ ماہرین تغذیہ ۴ وقت کھانا کھانے کی صلاح دیتے ہیں۔ صبح اٹھنے کے بعد ناشتہ، دوپہر میں کھانا، شام کے وقت پھر ہلکا ناشتہ کریں اور پھر رات کا کھانا کھائیں۔

(۳) **مناسب مقدار:** کھانا اپنے جسم اور معدے کی ضرورت کے مطابق ہونا

چاہیے۔ضرورت سے کم کھانا کھانے کی وجہ سے آپ کے جسم کی ضروریات پوری نہیں ہوں گی اور وزن کم ہوگا۔آپ کا جسم بیماریوں کی آماجگاہ بن جائے گا۔جبکہ دوسری طرف غذا کی زیادتی بھی بہت سے مسائل پیدا کرتی ہے۔موٹاپا اور اس سے جڑی بیماریاں اور بدہضمی پیدا ہونا شروع ہوجاتی ہیں اور پیٹ سے جڑے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔اللہ کے نبی حضرت محمدؐ نے بھی شکم سیری ہوکر کھانے کو منع فرمایا ہے،آپؐ فرماتے ہیں کہ ’’آدمی نے پیٹ کے (برتن) سے برا کوئی برتن نہیں بھرا۔ابن آدم کے لیے چند لقمے کافی ہیں جو اس کی کمر کو سیدھی رکھ سکے۔اگر بہت ضروری ہو تو ایک تہائی اس کے کھانے کے لیے،ایک تہائی اس کے پینے کے لیے اور ایک تہائی اس کے سانس لینے کے لیے ہونا چاہیے۔‘‘ (ترمذی،ابن ماجہ) عام طور سے ہم صبح ہلکہ ناشتہ کرتے ہیں پھر دوپہر میں بھرپیٹ کھانا کھاتے ہیں اور پھر رات میں جبکہ ہمیں سونا ہوتا ہے بہت زیادہ کھانا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ترتیب یوں ہونا چاہیے کہ ناشتہ زیادہ مقدار میں کھائیں پھر دوپہر میں کچھ کم اور رات میں بہت کم۔انگریزی میں بڑی اچھی کہاوت ہے Do breakfast like a king, lunch like a labour,and dinner like a begger....

اسلیے ماہر تغذیہ کا مشورہ لیں اور Diet Chart کے مطابق غذا کا استعمال کریں۔کھانے کے آدھے گھنٹے بعد پانی کا استعمال کریں۔ پانی کا بھرپور استعمال بہت سی بیماریوں کی روک تھام اور بہت سی بیماریوں کے علاج کے لیے ضروری ہے۔ پانی کے زائد استعمال کی وجہ سے صحت میں اضافہ ہوتا ہے اور انسان کی جلد تروتازہ رہتی ہے۔ اکثر اطباء گرم پانی پینے کی صلاح بھی دیتے ہیں۔

★ورزش اور کھیل کود:

محنت کا فقدان اور تعیش پسندانہ طرزِ زندگی ہی دراصل بہت سی بیماریوں کی جڑ ہے۔ اسلام نے صحت مند کھیل کود اور ورزش پر کافی زور دیا ہے۔حضرت محمدؐ نے تیراندازی، تیراکی، کشتی کے مقابلے اور گھڑسواری کی ترغیب اپنے قول وعمل سے دی۔ایک موقع پر آپؐ اور حضرت عائشہ سفر پر تھے۔آپ دونوں کے درمیان دوڑ کا مقابلہ ہوا جس میں آنحضرتؐ جیت گئے۔دوسری مرتبہ مقابلہ ہونے پر ام المومنین حضرت عائشہؓ جیت گئیں۔اس طرح دورِ نبویؐ میں کھیل کود کے مقابلے منعقد کیے جاتے تھے۔اور آپؐ جیتنے والے اصحاب کو انعامات سے بھی نوازتے تھے۔دراصل انسان کو محنت ومشقت کا عادی ہونا چاہیے ورنہ اگر وہ سست رہے تو اسے ڈھیروں قسم کی بیماریاں آلیتی ہیں۔صحت مند زندگی گزارنے کے لیے ورزش (Excercise) نہایت ناگزیر ہے۔ماہرین کے مطابق ہر فرد کو ہفتہ میں ۱۵۰ منٹ کی درمیانہ درجے کی ورزش نہایت ضروری ہے۔ورزش میں Walking اور Trademill دل کے لیے مفید ہوتے ہیں جبکہ پٹھوں کی مضبوطی کے لیے اور وزن کو منضبط کرنے کے لیے Heavy Exercise کی جاتی ہے جس میں جم خانے جاکر باقاعدہ ورزش شامل ہے۔ایک عام فرد اپنے گھر بھی مختلف طریقوں سے ورزش کرسکتا ہے۔رسّی کودنا بھی ایک اچھی ورزش ہوسکتی ہے۔اسی طرح صبح اور رات میں سونے سے قبل چہل قدمی بھی صحت کے لیے نہایت مفید ہے۔

تناؤ سے نجات :

تیز رفتار زندگی میں آج ہر شخص تناؤ سے بھری زندگی گزار رہا ہے۔اللہ پر توکل کی کمی کی وجہ سے انسان اپنے رزق، اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہے۔اور کچھ نہیں تو ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی جدوجہد کی وجہ سے بھی تناؤ بڑھ رہا ہے۔تناؤ سے بھری

> تناؤ کو کم کرنے کے لیے اللہ پر توکل بہترین علاج ہے۔ جبکہ ماہرین مراقبہ کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہ بات ریسرچ سے ثابت ہوچکی ہے کہ اسلامی عبادات اور خاص طور پر خشوع کے ساتھ ادا کی گئی نماز سے بھی توکل پیدا ہوتا ہے اور تناؤ میں کمی واقع ہوتی ہے۔

زندگی ہی دراصل بلڈ پریشر، ذیابیطس، دل کی بیماری اور موٹاپے جیسے جسمانی امراض اور بے شمار ذہنی اور نفسیاتی امراض کا موجب ہے۔تناؤ کو کم کرنے کے لیے اللہ پر توکل بہترین علاج ہے۔جبکہ ماہرین مراقبہ کا مشورہ دیتے ہیں۔یہ بات ریسرچ سے ثابت ہوچکی ہے کہ اسلامی عبادات اور خاص طور پر خشوع کے ساتھ ادا کی گئی نماز سے بھی توکل پیدا ہوتا ہے اور تناؤ میں کمی واقع ہوتی ہے۔ جب انسان تناؤ میں ہوتا ہے تو قرآن کی تلاوت بھی مفید ثابت ہوتی ہے۔اکثر قرآن کا مطالعہ کرنے والے اپنا تجربہ بتاتے ہیں کہ ’’جب ہم کسی وجہ سے تناؤ کی کیفیت میں تھے اور قرآن پڑھ رہے تھے تو قرآن کی آیات میں ہمارے لیے دلاسہ اور راہِ عمل تھی جس کی وجہ سے ہمارا ذہنی تناؤ (stress) کم ہوا۔تناؤ سے بچنے کے لیے مناسب نیند بھی نہایت ضروری ہے۔دوپہر میں قیلولہ کرنے کی سنت بھی نہایت مفید ثابت ہوسکتی ہے۔

طہارت و نظافت:

قرآن طہارت و پاکیزگی کے سلسلے میں ارشاد فرماتا ہے کہ ’’ان اللہ یحب التوابین ویحب المتطہرین (البقرۃ:۲۲۷)‘‘ بے شک اللہ پاک رہنے والوں اور توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔‘‘ آپؐ کا قول مبارک ہے کہ ’’الطھور شطر الایمان‘‘ (مسلم کتاب الطہارۃ)‘‘پاکی نصف ایمان ہے۔‘‘ اسی طرح اسلامی عبادات میں بھی آپ کو پاکی وصفائی کی تلقین اور اس کے عملی نمونے دیکھنے کو ملیں گے۔ہمارے جسم کی اور ہمارے آس پاس کے ماحول کی طہارت ہی دراصل ہمیں صحت مند رکھتی ہے۔صحت مند رہنے کے لیے روز نہائیں، سر میں تیل لگائیں، ناخن تراشتے رہیں، موئے زیر ناف اور بغل کے بال وقتاً فوقتاً اکھاڑیں۔کم سے کم ۲ مرتبہ مسواک کا استعمال کریں۔(صبح اور رات میں سوتے وقت) ہمیشہ وضو سے رہنے کی کوشش کریں۔

اخلاقی بگاڑ:

موجودہ دور میں جنسی بے راہ روی اور اخلاقی بگاڑ کی وجہ سے بھی جسمانی اور نفسیاتی صحت متاثر ہوتی ہے۔جنسی بے راہ روی کی وجہ سے بے شمار Sexually Transmitted Disease (STD's)، AIDS اور اعصابی بیماریاں عام ہوئیں ہیں۔اخلاق میں بہتری اور روحانیت کے ذریعہ ان بیماریوں کو روکا جاسکتا ہے۔اسی طرح شراب، بیڑی، سگریٹ، تمباکو اور دیگر نشہ آور ادویات کا استعمال بھی موجودہ لائف اسٹائل کا حصہ بن چکی ہے۔جس کی وجہ سے بے شمار بیماریوں نے انسانوں کو گھیر لیا ہے۔

ابوالاعلیٰ سید سبحانی

اسوۂ حسنہ سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے۔ یقیناً اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک ایک گوشہ اور آپ کے سفرِ حیات کا ایک ایک مرحلہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے اپنے اندر رہنمائی کا بہترین سامان رکھتا ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امہات المومنین رضی اللہ عنھن کی ازدواجی زندگی کا مطالعہ کرنے سے مثالی ازدواجی زندگی کے لیے بہت ہی قیمتی اور بہت ہی اعلیٰ اصولوں تک رسائی ہوتی ہے۔

سیرت امہات المومنین میں جو پہلو سب سے نمایاں نظر آتا ہے، وہ ہے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد میں امہات المومنین کا کردار۔ امہات المومنین ایمان کے اعلیٰ مقام پر فائز تھیں، اور ایمان کے تقاضوں کی تکمیل میں اول درجہ رکھتی تھیں۔ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دن رات بندوں کو بندوں کے رب سے روشناس کرانے کی جدوجہد میں مصروف رہتے اسی طرح ازواج مطہرات بھی دن رات اسی جدوجہد میں مصروف رہتیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مردوں کے درمیان دعوت وتبلیغ کا کام انجام دیتے تھے اور امہات المومنین خواتین کے درمیان دعوت وتبلیغ کا کام انجام دیتی تھیں۔ معروف سیرت نگار اور محقق مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی نے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سے زائد شادیوں کا مقصد ہی دین کی سربلندی کے لیے جدوجہد اور خواتین کے درمیان کارِ رسالت کی انجام دہی قرار دیا ہے، لکھتے ہیں:

”یہ شادیاں اپنی روح، اور اپنی غایت کے لحاظ سے بالکل جداگانہ نوعیت کی تھیں، اور اپنی الگ شان رکھتی تھیں!

یہ شادیاں ایک عظیم مقصد کے تحت ہوئی تھیں، وہ عظیم مقصد تھا عورتوں میں اسلام کی دعوت وتبلیغ، عورتوں کی دینی تعلیم وتربیت، خواتین کی دنیا میں کاررسالت کی انجام دہی! یہ شادیاں ہوئی تھیں صرف اور صرف اللہ کے لیے، اس کے دین کی سربلندی کے لیے، حلقۂ خواتین میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے، عورتوں اور بچوں میں قرآن پاک کی تعلیم وتربیت عام کرنے کے لیے!

یہ تمام شادیاں رحمت عالم ﷺ نے اس وقت کی تھیں جب عمر مبارک کا سورج ڈھل چکا تھا، اور وہ زندگی کی سہ پہر، اور زندگی کی شام کے اشارے دے رہا تھا! جب تک جوانی تھی، اور جوانی کی توانائیاں تھیں، اس وقت تک آپ کی خلوت کی رفیق صرف حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

عظمت وکمال کے تاجداروں کو چھوٹی ذہنیت کے ساتھ سمجھنا ممکن نہیں ہوتا۔ ان کی عظمتوں کو سمجھنے کے لیے اپنی ذہنی اور فکری سطح اونچی کرنی بہت ضروری ہوتی ہے۔ جو لوگ رحمت عالم ﷺ کی عظمت بے پایاں کو سمجھنا چاہیں، ان کے لیے یہ نکتہ سامنے رکھنا نہایت ضروری ہے!“ (مہر ومحبت جس کی شان! ﷺ، مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی، صفحہ ۴۷/۴۸)

مکی زندگی، دعوت دین کے سخت ترین مراحل پر مشتمل تھی، لیکن ان مراحل میں

شریک حیات حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے شریکِ مشن بن کر جس طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد کو تقویت پہنچائی، اور جس طرح سے اپنی زندگی آپؐ کے مشن کے لیے وقف کر دی، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے سال کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عام الحزن سے تعبیر کیا تھا، اس غم کے سال میں چچا ابوطالبؓ کا سہارا ابھی باقی نہیں رہا اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ کا ساتھ بھی باقی نہیں رہا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مدنی دور شروع ہوا تو کام کا میدان بہت زیادہ وسیع ہو گیا تھا۔ اس دور میں آپؐ نے یکے بعد دیگرے متعدد نکاح کیے، یہ تمام نکاح صرف اور صرف دعوتی مقاصد کے تحت ہوئے، اس بات کا آپؐ کی ازواج مطہرات کو پورا پورا اندازہ تھا، چنانچہ تمام ہی ازواج مطہراتؓ نے آپ کے مشن کو تقویت پہنچانے میں اپنی زندگیاں لگا دیں۔

یہ ذہنی اور فکری ہم آہنگی ازدواجی زندگی کی کامیابی اور خوش گواری کی ایک اہم بنیاد ہے۔ یہ بنیاد مضبوط ہو تو اس رشتے کے نتیجہ میں تعمیر ہونے والی عمارت بھی اتنی ہی مضبوط اور مستحکم ہوگی۔ خیر امت سے وابستگی کا تقاضا ہے کہ اس پہلو پر خاص توجہ دی جائے، تاکہ منصب کے تقاضوں کی تکمیل میں مرد وزن، دونوں قدم بہ قدم آگے بڑھیں، یا کم از کم ایک قدم آگے بڑھائے تو دوسرے کی جانب سے زیادہ سے زیادہ سپورٹ مل سکے۔ یہ ذہنی اور فکری ہم آہنگی کبھی اللہ رب العزت کی جانب سے ودیعت کی جاتی ہے اور کبھی اس کے لیے کافی محنت کرنی پڑتی ہے۔

امہات المومنین رضی اللہ عنہن کی سیرت کا سب سے اہم پیغام یہی ہے کہ مسلم خواتین ایمان لانے کے ساتھ ساتھ ایمان کے تقاضوں کی تکمیل میں لگ جائیں، وہ اپنے مشن سے وابستگی اختیار کر لیں، بالکل ویسی ہی وابستگی جیسی وابستگی امہات المومنین کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے ساتھ تھی۔

حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت سودہ بنت زمعہؓ، حضرت حفصہ بنت عمر بن الخطابؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت زینب بنت جحشؓ، حضرت جویریہ بنت الحارثؓ، حضرت زینب بنت خزیمہؓ، حضرت میمونہ بنت الحارثؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت ماریہ قبطیہؓ یہ سب دور اوّل میں دعوت واصلاح کی تاریخ کے اہم اور نمایاں ترین نام ہیں۔ ان سب کی دعوتی واصلاحی خدمات پر ابھی کام کرنا باقی ہے۔

یہ کام اس وجہ سے بھی اہم ہو جاتا ہے کہ ازواج مطہرات، امہات المومنین رضی اللہ عنہن کی سیرت کے تعلق سے اپنے بھی غلط فہمیوں کا شکار ہیں اور دوسرے بھی، اور اس پر مستزاد یہ کہ دشمنان اسلام نے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جن گوشوں کو سب سے زیادہ اپنے شیطانی پروپیگنڈے کے لیے استعمال کیا ہے اس میں سرفہرست آپؐ کی ازدواجی زندگی ہے۔

یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امہات المومنینؓ کی ازدواجی زندگی کا پہلا اور سب سے اہم باب تھا۔ امہات المومنینؓ کی ازدواجی زندگی کا دوسرا اہم باب ازدواجی حقوق اور ازدواجی تقاضوں کی تکمیل سے متعلق ہے۔ ان حقوق اور تقاضوں کی تکمیل میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پیش پیش رہتے اور آپؐ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن بھی پیش پیش رہتیں۔ اللہ کے رسولؐ اپنی غیر معمولی مصروفیات کے باوجود امہات المومنین کے لیے اپنا قیمتی وقت نکالتے۔ یہ وقت روکھی سوکھی ملاقات یا ان کی دینی سرگرمیوں کی رپورٹ لینے کے لیے نہیں ہوتا تھا، بلکہ یہ ان کی زندگیوں میں کچھ خوبصورت لمحات کے اضافے کے لیے ہوتا تھا۔ اس دوران امہات المومنین کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے مستفید ہونے کا خوب موقع ملتا اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے اور آپ کے لیے زیادہ سے زیادہ تسکین کا سامان کرنے کا بھی خوب موقع ملتا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا نرالی تھی۔ گھر میں داخل ہونا، ازواج کو مخاطب کرنا، ان سے گفتگو کرنا، ان کے ساتھ کھانا کھانا، ان کے ساتھ آرام کے کچھ لمحات گزارنا، ان کے ساتھ کچھ تفریحی گفتگو کرنا، ان کے گھر کے کاموں میں تعاون کرنا، غرض اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے امہات المومنین کے ساتھ جو بھی لمحات محفوظ کر لیے گئے، وہ تمام ہی لمحات امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے ساتھ آپؐ کے اعلیٰ اخلاق و کردار کی گواہی دیتے ہیں اور مثالی ازدواجی زندگی کے لیے رہنما اصول پیش کرتے ہیں۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام تر مصروفیات اور دوڑ دھوپ کے باوجود دن رات میں ایک بار ضرور اس بات کی کوشش کرتے کہ ازواج مطہرات سے ملاقات کر لیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم دن اور رات میں ایک بار تمام ازواج مطہرات کے ہاں تشریف لے جاتے۔ ''کان صلی اللہ علیہ وسلم یدور علی نساءہ فی الساعۃ الواحدۃ من اللیل والنہار''۔ (البخاری)

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ آپؐ رات کا ایک بڑا حصہ رب کی عبادت میں گزارتے، (إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَى مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ۔ سورۃ مزمل: ۲۰) لیکن خاص بات یہ ہے کہ جس طرح دن کی جدوجہد میں ازواج کے حقوق متاثر نہیں ہونے دیتے، اسی طرح رات کی اس عبادت کی وجہ سے بھی ازواج کے حقوق متاثر نہیں ہونے دیتے، جس رات میں جس کی باری ہوتی وہ رات اس کی ہوتی۔ روایتوں میں آتا ہے کہ بی بی عائشہ سے ایک بار آنحضور ﷺ نے کہا: کیا یہ ممکن ہے کہ آج رات تم مجھے اپنے رب کی عبادت کی اجازت دو۔ بی بی عائشہ نے کہا: رسول خدا! میں آپ کے ساتھ رہنا پسند کرتی ہوں مگر آپ کی خواہش کی تکمیل بھی مجھے بہت محبوب ہے، میں نے آپ کو اجازت دی۔ ''یا عائشۃ! **هل لک أن تأذني لي الليلة في عبادة ربي؟ فقلت**: یا رسول اللہ، انی لاحب قربک واحب ھواک، قد اذنت لک''، یہ وہ واقعہ ہے جس کو حضرت عائشہ اپنی زندگی کے خوبصورت ترین لمحات میں شمار کرتی تھیں، ایک دفعہ جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت عائشہؓ سے سوال کیا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا آپؓ کی نظر میں جو سب سے تعجب انگیز واقعہ ہو، وہ بیان کریں، اُخبرینی بأعجب ما رأیت من أمر رسول اللہ ﷺ، تو اس موقع پر حضرت عائشہؓ نے یہی واقعہ بیان کیا۔ (صحیح ابن حبان)

ظاہر سی بات ہے کہ امہات المومنین کی راتیں عام انسانوں کی راتوں سے مختلف ہوتی تھیں، وہ بھی اللہ کے رسولؐ کی طرح دن کے اوقات میں دینی جدوجہد میں مصروف ہوتی تھیں اور رات کا ایک حصہ رب کے حضور سجدوں اور مناجات میں گزارتی تھیں، لیکن جس دن اللہ کے رسولؐ کا ان کے ہاں قیام ہوتا تھا، اس دن ان کے لیے سب سے بڑی

عبادت یہی ہوتی تھی کہ وہ اللہ کے رسولؐ کا دل خوش کریں، اور ان کے ساتھ کچھ حسین لمحات گزارنے کی سعادت حاصل کرلیں، اور اللہ کے رسولؐ بھی اس کا پورا خیال رکھتے کہ ازواج مطہرات کی دلجوئی اور ان کی تسکین کا زیادہ سے زیادہ سامان کرسکیں۔

ایک سے زائد نکاح کی صورت میں جو شکایت سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے وہ مرد کا کسی ایک کی جانب مائل ہوجانا اور دوسری کو جان بوجھ کر نظر انداز کردینا ہے۔ یہ ایک شکایت اپنے ساتھ بہت سی شکایتوں کو لے کر آتی ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام ہی ازواج مطہرات کے ساتھ عدل کا رویہ اختیار کرتے، ان کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے، کبھی کوئی ایسی بات نہ ہونے دیتے جس سے دوسری ازواج کو تکلیف پہنچنے کا امکان ہو۔ اللہ کے رسولؐ نے اس سلسلے میں بہت سخت تنبیہ فرمائی ہے، ترمذی کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں سے ایک ہی کی جانب مائل رہتا ہو دوسری کو نظر انداز کرتے ہوئے، تو قیامت کے دن اس کا ایک کندھا جھکا ہوا ہوگا۔ ’’من کان لہ امرأتان یمیل لاحداھما علی الاخری، جاء یوم القیامۃ أحد شقیہ مائل‘‘۔ (الترمذی، صححہ الالبانی)

آپؐ کا معمول تھا کہ گھر میں داخل ہوتے تو ازواج مطہرات کو الگ الگ اور انوکھے ناموں سے پکارتے، کبھی متعدد افراد موجود ہوتے تو اس کے لیے بھی نرالا انداز اختیار کرتے، روایتوں میں آتا ہے کہ آپؐ حضرت عائشہؓ کو کبھی ’’یا عائش‘‘ کہہ کر پکارتے، کبھی ’’یا موفقۃ‘‘ کہہ کر پکارتے، (الترمذی) کبھی ’’یا بنت الصدیق‘‘ کہہ کر بلاتے، کبھی ’’یا بنت ابی بکر‘‘ کہہ کر متوجہ کرتے، کبھی ’’الحمیراء‘‘ کہہ کر بلاتے۔ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو دیگر خواتین بھی وہاں موجود تھیں، چنانچہ آپ نے عام اسلوب سے ہٹ کر مخاطب فرمایا: ’’کیف تیکم‘‘۔ حضرت عروہ سے روایت ہے کہ ایک بار حضرت عائشہؓ نے اللہ کے رسولؐ سے شکوہ کیا کہ ہماری تمام سہیلیوں کی کچھ نہ کچھ کنیت ہے، لیکن میری کوئی کنیت نہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ تم اپنی کنیت اپنی بہن اسماءؓ کے بیٹے عبداللہؓ کے نام پر رکھ لو۔ عروہؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد سے آپؓ کی کنیت ام عبداللہ ہوگئی۔ (سنن ابی داؤد)

آپؐ کا یہ بھی معمول تھا کہ جب بھی موقع ملتا، اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ کھانے پینے کا اہتمام فرماتے، حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ میں پانی پیتی پھر اللہ کے رسولؐ کو پلاتی، وہ پیالے میں منہ لگا کر اسی جگہ سے پیتے جہاں سے منہ لگا کر میں نے پیا ہوتا، پھر میں اس جگہ کو چوس لیتی، تو آپ پھر اسی جگہ سے پیتے جہاں سے میں نے پیا ہوتا۔ **کنت أشرب فأناولہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیضع فاہ علی موضع فیّ، واتعرق العرق فیضع فاہ علی موضع فیّ**۔ (مسلم) اللہ کے رسولؐ نے اس کی ترغیب بھی دی ہے کہ کھانا ایک ساتھ کھایا جائے اور ایک دوسرے کو اپنے ہاتھ سے لقمہ دیا جائے، ایک روایت میں ہے کہ تم جو بھی نیکی کا کام کرتے ہو اس پر تمہیں اجر ملتا ہے، یہاں تک کہ وہ لقمہ جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو، اس پر بھی تمہیں اجر ملے گا، **انک لن تنفق نفقۃ الا اجرت علیھا حتی اللقمۃ ترفعھا الی فی امرأتک**۔ (بخاری) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی ترغیب بھی دی ہے کہ بیویوں کے جائز مطالبات پورے کرنے کی کوشش کی جائے، جب کچھ کھائیں تو انہیں بھی کھانے پر یاد کرلیں، اور جب اپنے لیے کپڑے بنوائیں تو ان کے لیے بھی بنوادیا کریں، یہ زوجین میں محبت کے اضافہ کا ایک اہم اصول ہے کہ دونوں ایک دوسرے کا اس قدر خیال رکھیں کہ جب وہ اپنے لیے کچھ کریں تو ان کو فوراً ہی اپنے شریک حیات کا خیال آجائے، اور اس طرح زندگی کو مزید خوب صورت بناتے چلے جائیں، نبی صلی اللہ کا فرمان ہے: **اطعم اذا طعمت واکس اذا اکتسیت**۔ (مستدرک حاکم)

اللہ کے رسولؐ نے ازواج مطہرات کو خود سے بہت قریب رکھا۔ آپؐ بار بار ان کے ساتھ اپنائیت کا اظہار کرتے اور وہ بار بار اس اظہار کی طالب ہوتیں، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات میں سے کسی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے، **کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتکیء فی حجری وأنا حائض**۔ (مسلم) ام المومنین عائشہؓ سے ہی روایت ہے کہ اللہ کے رسولؐ تو روزے کی حالت میں بھی بوسہ لیا کرتے تھے، **کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقبل وھو صائم**۔ (مسلم) ان روایات سے اللہ کے رسولؐ کے ازواج مطہرات کے ساتھ تعلق اور لگاؤ کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔

امہات المومنین بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی ہی قربت اور لگاؤ محسوس کرتی تھیں، چنانچہ وہ اللہ کے رسولؐ کی ہر طرح سے خدمت کرنے اور آپؐ کا دل خوش کرنے کی کوشش کرتیں، کبھی وہ اللہ کے رسولؐ کے بالوں میں کنگھی کررہی ہوتیں اور کبھی وہ آپؐ کے ناخن تراش رہی ہوتیں، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اللہ کے رسولؐ مسجد میں ہوتے تھے، وہیں لیٹے لیٹے میرے حجرے میں سر داخل کردیتے تھے، اور میں ان کے بالوں میں کنگھی کردیا کرتی تھی۔ **لیدخل علیّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رأسہ وھو فی المسجد فأرجلہ**۔ (مسلم)

اللہ کے رسولؐ کو خوشبو بہت پسند تھی، آپ کا معمول تھا کہ ہمیشہ خوشبو استعمال کرتے، ازواج مطہرات کو اس سے بڑی خوشی ہوتی، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، کہتی ہیں کہ میں حالت احرام میں بھی اللہ کے رسولؐ کے بالوں کے درمیانی حصے (مانگھ) میں مشک کی چمک محسوس کرتی تھی، **کأنی انظر الی وبیص المسک فی مفرق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو محرم**۔ (مسلم)

رات کے ابتدائی حصے میں اللہ کے رسولؐ ازواج مطہرات کے ساتھ چہل قدمی کے لیے بھی نکلا کرتے تھے، بخاری کی روایت ہے کہ رات کے وقت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کے ساتھ ٹہل ٹہل کر گفتگو کیا کرتے تھے۔ **کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان باللیل سار مع عائشۃ یتحدث**۔ (البخاری) اسی طرح کبھی کبھی آپ کچھ قصے اور واقعات بھی سناتے تھے، جیسا کہ بخاری ومسلم میں حضرت عائشہؓ سے ام زرع کی تفصیلی حدیث مروی ہے۔ اللہ کے رسولؐ کا یہ معمول یقینا تمام ہی ازواج کے ساتھ رہا ہوگا، جس دن عائشہؓ کی باری ہوتی اس دن آپ کے ساتھ چہل قدمی کرتے اور جس دن دوسری ازواج مطہرات کی باری ہوتی اس دن ان کے ساتھ چہل قدمی کرتے۔

اللہ کے رسولؐ کے ذوق اور مزاج کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ وہ ازواج مطہرات کے ساتھ تفریحی گفتگوئیں بھی کیا کرتے، اور ازواج مطہرات جب کوئی تفریح کی بات کرتیں تو آپ خوب محظوظ ہوتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! فرض کیجئے آپ ایک وادی میں گئے، وہاں ایک درخت ملا جس سے کچھ کھایا جاچکا

ہے، اور ایک درخت ملا جس سے کچھ بھی نہیں کھایا گیا ہے، تو آپ ان دونوں درختوں میں سے کس سے اپنے اونٹ کو کھلانا پسند کریں گے؟ اس پر اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: جس سے نہیں کھایا گیا ہے۔ (بخاری) حضرت عائشہؓ یہاں بتانا چاہ رہی تھیں کہ اللہ کے رسولؐ نے ان کے علاوہ کسی بھی کنواری لڑکی سے شادی نہیں کی۔ معروف مصری عالم ڈاکٹر صلاح سلطان اللہ کے رسولؐ کے مزاح اور ظرافت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پیارے نبی ﷺ حضرت عائشہؓ کے ساتھ دو بار دوڑ کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آپ ﷺ سے زیادہ فکرمندی اور بے قراری کی زندگی کس کی تھی، پھر بھی اہل خانہ کا دل بہلانے کے لیے وقت نکال لیا کرتے تھے۔ آخر اس میں کیا حرج ہے کہ کوئی خالی جگہ تلاش کر کے دونوں دوڑ کا مقابلہ کریں اور ایک ایک بار ہر ایک کو جیتنے کا موقعہ دے دیا جائے، کیونکہ یہ اولمپک کی دوڑ کا مقابلہ تھوڑی ہی ہے، یہ تو شوہر بیوی کے بیچ تفریح کا ایک بہانہ ہے اس میں دوسرے کی خاطر ایک خود سے ہار جائے، تو اس ہار میں بھی کتنا لطف ہے۔''

آگے وہ لکھتے ہیں: ''حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: آپ ﷺ تفریح بھی کرتے تھے البتہ تفریح میں بھی سچ بولتے تھے۔

حضرت عائشہؓ کے ساتھ آپ ﷺ نے دوڑ کا مقابلہ کیا اور دوسری بار جیت جانے کے بعد از راہِ ظرافت کہا یہ پچھلی بار کا بدلہ ہے۔

آپ ﷺ نے ایک صحابی کو مشورہ دیا: کنواری سے شادی کیوں نہیں کرتے کہ آپس میں کھیل کود اور ہنسی مذاق بھی کر سکو۔'' (محبت کی کنجیاں، ڈاکٹر صلاح سلطان، اردو ترجمہ: محی الدین غازی، صفحہ ۳۹ر ۴۰)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کے ساتھ معاملہ کرنے میں ان کے نسوانی جذبات اور ان کے ناز و انداز کی بھی پوری رعایت کرتے، حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی بی بی پر ہاتھ نہیں اٹھایا، **ما ضرب رسول اللہ صلی اللہ علیه و سلم امرأة قط**۔ (النسائی)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب بھی سفر پر جاتے تو قرعہ ڈالتے اور جس کے نام کا قرعہ نکل جاتا اس کو اپنے ساتھ سفر پر لے جاتے۔ ایک بار وہ ام المومنین حضرت صفیہؓ کے ساتھ سفر پر تھے، اس دن سفر میں ساتھ جانے کی باری ان کی تھی، دوران سفر صفیہؓ کی سواری کچھ پیچھے رہ گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہ پیچھے رہ گئیں تو بڑھ کر ان کے پاس گئے، دیکھا وہ رو رہی تھیں، اور شکوہ کر رہی تھیں کہ آپؐ نے مجھے بہت ہی سست رفتار اونٹ پر سوار کیا ہے، اللہ کے رسولؐ نے اپنے ہاتھوں سے حضرت صفیہؓ کے آنسو پونچھے، اور انہیں چپ کرایا۔ **کانت صفیة مع رسول اللہ صلی اللہ علیه و سلم فی سفر، و کان ذلک یومها، فأبطأت فی المسیر، فاستقبلها رسول اللہ صلی اللہ علیه و سلم و هی تبکی، و تقول حملتنی علی بعیر بطیء، فجعل رسول اللہ یمسح بیدیه عینها و یسکتها**۔ (النسائی)

آپؐ ازواج مطہرات کو خود ہی اونٹ پر سوار کرتے اور خود ہی اتارتے، اس میں کبھی کسی قسم کا تکلف حائل نہ ہوتا، حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ خیبر سے واپسی پر ہم مدینہ کے لیے نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اونٹ کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں، آپؐ نے اپنے گھٹنے زمین پر رکھے ہوئے ہیں اور حضرت صفیہؓ ان کے گھٹنوں پر پیر رکھ کر اونٹ پر سوار ہو رہی ہیں۔ **خرجنا الی المدینة قادمین من خیبر۔ فرأیت النبی صلی اللہ علیه و آله و سلم یجلس عند بعیره، فیضع رکبته و تضع صفیة رجلها علی رکبتیه حتی ترکب البعیر**۔ (بخاری)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سفر کے علاوہ بھی مختلف مواقع پر اپنی ازواج مطہرات کو ساتھ رکھتے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ کچھ حبشی اپنے مخصوص کھیل کھیل رہے تھے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اوٹ میں کھڑی وہ کھیل دیکھ رہی تھیں۔ (بخاری)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم موقع بہ موقع ازواج مطہرات کی تعریف بھی کرتے اور ان کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے۔ حضرت خدیجہ کی تو بات ہی الگ ہے، وہ سخت ترین ایام میں آپ کے ساتھ تھیں، چنانچہ آپؐ ان کا بار بار تذکرہ کرتے، اور کہا کرتے کہ خدیجہ کی محبت میرے لیے عطیہ خداوندی ہے، **انی رزقت حبها**۔ (مسلم) آپؐ کی حضرت خدیجہ سے محبت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ آپؐ جب قربانی کرتے تو فرماتے کہ اس کا کچھ حصہ خدیجہ کی سہیلیوں کے ہاں بھی بھیج دو، **کان رسول اللہ صلی اللہ علیه و سلم اذا ذبح شاة یقول: أرسلوا بها الی اصدقاء خدیجة**۔ (مسلم) اسی طرح آپؐ تمام ہی ازواج مطہرات کا خیال رکھتے، ان کی دلجوئی کرتے اور موقع بہ موقع ان کی تعریف و تحسین کرتے اور ان کی خدمات کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی حوصلہ افزائی فرماتے۔

حیرت ہوتی ہے کہ رسول پاکؐ اپنی تمام تر مصروفیات اور دوڑ دھوپ کے باوجود کس قدر اپنی ازواج مطہرات کا خیال رکھتے، کس قدر ان کی دلجوئی فرماتے، یہاں تک کہ گھر کے کام کاج میں بھی ان کا ہاتھ بٹاتے تھے، امہات المومنین کی ازدواجی زندگی کے یہ تمام ہی پہلو اپنے اندر کتنا بہترین پیغام رکھتے ہیں، اور ایک مثالی ازدواجی زندگی کی طرف پیش قدمی کے لیے کس قدر مہمیز کا کام کرتے ہیں۔ ایک بار حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر پر ہوتے تھے تو کیا کرتے تھے؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا: گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ **سئلت عائشة ما کان النبی صلی اللہ علیه و سلم یصنع فی بیته؟ قالت: کان فی مهنة اهله**۔ (بخاری)

اس تحریر میں امہات المومنین رضی اللہ عنھن کی مثالی ازدواجی زندگی سے متعلق کچھ واقعات پیش کیے گئے ہیں، ان واقعات کے علاوہ بھی کتب احادیث اور کتب تاریخ میں بہت سے واقعات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امہات المومنین رضی اللہ عنھن کی ازدواجی زندگی کس قدر مثالی اور کس قدر حسن و رعنائی سے بھرپور تھی۔

آج جبکہ خاندان کا شیرازہ بری طرح بکھرتا جا رہا ہے، ازدواجی زندگی کے مسائل میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، غیر مسلم سماج بھی اس مصیبت سے دوچار ہے اور مسلم سماج بھی اس مصیبت کا شکار ہے، ضرورت ہے کہ ان حالات میں امہات المومنین کی ازدواجی زندگی کا بار بار مطالعہ کیا جائے، امہات المومنین کی مثالی ازدواجی زندگی سے فکری و عملی ہر سطح پر رہنمائی حاصل کی جائے اور اس رہنمائی کو عام کرنے کے لیے ہر ممکن راستہ اختیار کیا جائے۔

اسلام میں تفریح کا تصور

■ محمد فراز احمد

انسانی زندگی کا ہر پہلو انتہائی خوبصورت انداز پیش کرتا ہے، قدرت نے انسان کی تخلیق انتہائی احسن انداز میں کی ہے نہ صرف انسان بلکہ کائنات کی ہر شئے سجاوٹ و بناوٹ کے آلات سے مزین ہے۔ پہاڑوں کے اشکال، سمندر کا پانی، پانی کے جانور، ان کی رنگارنگیٔ اقسام، ہواؤں کی مہک اور چہچہاتے میٹھی آواز والے پرندے، زمینی جاندار؛ گویا کائنات مختلف النوع طریقہ سے انسان کے لیے بنائی گئی ہے۔ قرآن نے بھی مختلف مقامات پر اس کی خوبصورتی کا برملا اظہار کیا ہے۔ سورہ رحمن خاص طور سے اس کا مظہر ہے۔

قدرت نے جب کائنات کی ہر شئے کو بنایا ہے تو وہ اسی لیے کہ انسان اس سے فیض یاب ہو سکے ”اسی نے تمہاری خاطر زمین کی ساری چیزیں تخلیق کی ہیں۔“ (البقرہ 27) اس لیے انسان کو بھی چاہیے کہ وہ ان تمام چیزوں سے لطف اندوز ہو۔ بعض اوقات اسلام کو تنگ نظر پیش کیا جاتا ہے، لیکن اسلام نے تو ”سیروفی الارض“ اور ”یتفکرون فی خلق السمٰوات والارض“ وغیرہ جیسی آیتیں نازل کرتے ہوئے انسان کو وسعت نظری عطا کی، لیکن افسوس کہ تنگ نظری نے اس وسعت نظری کو مغلوب کر دیا۔

یہی معاملہ سیر و تفریح کے ذرائع میں بھی خاص طور سے اپنایا گیا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ دلوں کو تھوڑی دیر کے لیے تفریح پہنچایا کرو کیونکہ دلوں میں اکتاہٹ آجائے تو دل اندھے ہوجاتے ہیں۔ نبیؐ کی سیرت مبارکہ سے بھی تفریح کے واقعات سامنے آتے ہیں کہ مسجد نبوی کے صحن میں کھیل وغیرہ کا انعقاد، آپؐ اور حضرت عائشہؓ کا دوڑ لگانا وغیرہ، گویا تفریح میں بھی اسلام نے کوئی پابندی نہیں لگائی، اس کی ایک قسم شعر و سخن اور موسیقی وغیرہ بھی ہیں۔ اس زمرہ میں اکثر علماء نے شدت پسندی اختیار کی لیکن یہ اسلام کی راہ اعتدال سے موافقت رکھنے والا رویہ نہیں ہے۔ بعض لوگ نغمہ وغیرہ کے سننے پر تحریم کے فتوے بھی صادر کردیتے ہیں۔ قرآن مجید نے جو حرام قرار دیا ہے اس میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ آیا وہ حرام ہے یا حلال، اور یہی معاملہ حلال کردہ چیزوں پر بھی آتا ہے۔ لیکن گیت و نغمہ کے سلسلہ میں ایسا کوئی حکم نہیں ملتا کہ آیا یہ حرام ہے یا حلال، اس سے یہ نہ سمجھ لیں کہ اللہ سے نعوذ باللہ بھول ہوگئی، اللہ تو ہر شئے کا خالق ہے، ہر چیز کا تخلیق کار اللہ ہے اور ہر چیز اسی لیے تخلیق کی گئی ہے کہ انسان فائدہ اٹھا سکیں۔

موسیقی میں جائز اور ناجائز کا سوال ضرور ہے کہ کونسی جائز ہے اور کونسی ناجائز! حرام حرام کی رَٹ لگانے والوں سے گزارش ہے کہ قاسم بن محمد بن ابوبکر سے جب پوچھا گیا تھا کہ کیا موسیقی حرام ہے، تو آپ نے تین بار سوال کرنے والے سے منہ موڑ لیا تھا اور چوتھی دفعہ سوال کرنے کے بعد انتہائی غصے سے فرمایا تھا کہ ”حرام وہی ہے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام کے لفظ کے ساتھ حرام کہا ہے“ اس کے بعد جائز، ناجائز، مکروہ باقی رہ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں علامہ یوسف القرضاوی صاحب کا نقطہ نظر معتدل نظر آتا ہے، موصوف نے گیت اور نغمہ کو الگ زمرے میں رکھا ہے جس کے بارے میں قرآن نے خاموشی اختیار کی اور جس کے بارے میں جواب دہی بھی نہیں ہے۔ لیکن بعض نے شدت پسندی کو بھی اختیار کیا، یوسف القرضاوی فرماتے ہیں کہ کسی بھی چیز کو حرام قرار دینا آسان کام نہیں ہے اور موسیقی کے بارے میں جو احادیث آئی ہیں وہ سب ضعیف ہیں اور ضعیف احادیث کو لیکر کسی بھی چیز کو حرام نہیں کہا جاسکتا، اس کا تفصیلی جائزہ لینے کے لیے فتاوی یوسف القرضاوی کا مطالعہ بہتر ہوگا۔

اس موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد کا موسیقی کے متعلق خیال بھی پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مولانا آزاد کو موسیقی سے جو دلچسپی تھی اس کا حال ”غبارِ خاطر“ سے معلوم ہوتا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں ”شاید آپ کو معلوم نہیں ایک زمانے میں مجھے فنِ موسیقی کے مطالعہ اور مشق کا بھی شوق رہ چکا ہے، اس کا اشتغال کئی سال تک جاری رہا، ابتدا اس کی یوں ہوئی کہ 1905 میں جب میں تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور طلباء کو پڑھانے میں مشغول تھا تو کتابوں کا شوق مجھے اکثر ایک کتب فروش خدا بخش کے یہاں لے جایا کرتا تھا جس نے ویلزلی اسٹریٹ میں مدرسہ کالج کے سامنے دکان لے رکھی تھی اور زیادہ تر عربی و فارسی کی قلمی کتابوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے فقیر اللہ سیف خاں کی راگ درپن کا ایک نہایت خوش خط اور مصور نسخہ بھی دکھایا اور کہا کہ یہ کتاب فنِ موسیقی پر ہے۔“

مولانا آزاد نے کتاب لے لی اور گھر آ کر اول تا آخر پڑھی۔ سمجھ میں نہ آئی اس لیے کہ موسیقی کی اصطلاحوں سے واقفیت نہ تھی۔ باپ کے ایک مرید سے جو اس کوچہ سے آیا تھا خفیہ طریقے سے علم و عمل کا سلسلہ جاری کیا، مگر ''پھر کوشش کی اپنے طریقے سے خود سمجھوں۔ موسیقی کے آلات میں زیادہ تر توجہ ستار پر ہوئی اور بہت جلد انگلیاں آشنا ہو گئیں''۔ مولانا کی ستار کی مشق چار پانچ سال جاری رہی۔ بین سے بھی انگلیاں نا آشنا نہیں رہیں، لیکن زیادہ دل بستگی اس سے نہ ہو سکی اور پھر ایک وقت آیا کہ یہ مشغلہ یک قلم متروک ہو گیا۔ لیکن موسیقی کا ذوق اور تاثر زندگی بھر دل سے نہ نکل سکا۔ لکھتے ہیں ''میں آپ سے ایک بات کہوں، میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے، میں زندگی کی احتیاجوں میں ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آوازِ خوش میرے لیے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا اور جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے۔''

اپنے اس زمانے کا، جب ابوالکلام آزاد موسیقی کے عملی سحر میں گرفتار تھے، ایک واقعہ لکھتے ہیں۔ ''آگرہ کے سفر کا اتفاق ہوا، اپریل کا مہینہ تھا اور چاندنی کی ڈھلتی ہوئی راتیں تھیں۔ جب رات کا پچھلا پہر شروع ہونے کو ہوتا تو چاند پردۂ شب ہٹا کر یکا یک جھانکنے لگتا۔ میں نے خاص طور پر کوشش کر کے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ رات کو ستار لے کر تاج محل چلا جاتا اور اس کی چھت پر جمنا کے رخ بیٹھ جاتا، پھر جونہی چاندنی پھیلنے لگتی ستار پر کوئی گیت چھیڑ دیتا اور اس میں محو ہو جاتا، کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریبِ تخیل کے کیسے کیسے جلوے انہیں آنکھوں کے آگے گزر چکے ہیں۔ رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات، چاروں طرف تاج کے ستارے سر اُٹھائے کھڑے تھے، بُرجیاں دم بخود بیٹھی تھیں، آپ یاد کریں یا نہ کریں مگر یہ واقعہ ہے کہ اس عالم میں، میں نے بارہا بُرجیوں سے باتیں کی ہیں۔''

اس موضوع پر حرمت اور حلت کے متعلق بہت گفتگو ہو گئی ہے، لوگوں نے اس کی مخالفت میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن وہ سب فطرت کے عین مخالف ہے اور اسلام دین فطرت ہے، نبیؐ نے شادی بیاہ، خوشی و عید کے مواقع پر موسیقی کی اجازت دی، سننے والوں کو روکا نہیں، غور کریں کہ کیا ایک چیز ایک موقع پر حلال ہو گی تو دوسری طرف وہی چیز حرام کیسے ہو گی؟ موسیقی اور اس جیسے ثقافتی طرز پر مبنی پروگرامز کو حرام کہہ کر اسلام کو تنگ نظر ثابت کیا جاتا ہے۔ دور حاضر جو کہ ثقافتی عروج کا دور ہے، ٹکنالوجی اور ذرائع ابلاغ کا دور ہے اس میں ضروری ہے کہ اسلام کی وسعت النظری کو پیش کریں اور ان کے ذریعہ دین اسلام کی ترویج کا کام کریں اور جائز حدود میں تفریح کا سامان بھی مہیا کریں۔

عجب نہیں ہے کہ یہ چارسو بدل جائے

ڈاکٹر سیدہ اشرف النساء

موجودہ دور کے حالات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی اندازہوتا ہے کہ یہ دور پھر کسی ابراہیمؑ کی تلاش میں ہے، فرد سے لے کر خاندان، معاشرہ، قوم سب ہی افراط و تفریط، انتشار، بے چینی، اضطراب، کشمکش بلکہ ذلت و رسوائی کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہر ذی شعور انسان کی یہ خواہش ہے کہ حالات بدل جائے، حالات بدلنے کے لیے ہمیں خود بدلنا ہوگا، کیونکہ ''ہم سے زمانہ خود ہے، زمانے سے ہم نہیں''۔

تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں، منفی اور مثبت۔ منفی پہلو پر ہم غور کریں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ''ہم الزام ان کو دیتے تھے، قصور اپنا نکل آیا''۔ لہٰذا نہ الزام تراشیاں ہوں نہ قصور اپنا نکلنے پر ہمیں بغلیں جھانکنے کی نوبت آئے۔ اس لئے ہم مثبت پہلو پر نظر رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم مسلم ہیں، فرمانبرداری اور ذمہ داری ہماری سرشت میں داخل ہے، اس لئے حالات کی یکسوئی کے لیے، انسانیت کی جانکنی کے اس موقع پر کیوں نہ ہم اس ہدایت نامہ کی طرف، قرآن پاک کی طرف رجوع کریں۔ جو ساری انسانیت کے امراض کے لیے نسخۂ شفا ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے نازل کیا۔ اور اپنے پیغمبر حضرت محمدؐ کو اس کی تفسیر، اس کے عملی نمونے کے طور پر مبعوث فرمایا ہے تاکہ ہم آپؐ سے رہنمائی حاصل کریں۔

ہم قرآن پاک کے چند ان راہنما اصولوں اور ہدایتوں کو دیکھتے چلیں گے جن سے ہم اپنے انتشار کو ختم کر کے اپنی اصلاح کر سکیں اور ایک پرسکون گھر اور خوشگوار خاندان کو پا سکیں، سورۂ بینہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے دو گروہ کا ذکر کیا ہے، بہترین اور بدترین۔ نیک اور بد۔ انسانی برادری میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف شر اور خیر ہی کی بنیادوں پر ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی فرق ہے تو وہ شناخت کے لیے ہے نہ کہ فوقیت اور نفرت کے لیے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے: ''اے ایمان والو! تم اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔'' کسی تحفظ کے بغیر اپنی پوری زندگی کو اسلام کے تحت لے آؤ، تمہارے خیالات، نظریات، علوم، طور طریقے۔ معاملات، سعی و عمل کے راستے۔ سب کے سب بالکل تابع اسلام ہوں، ایسا نہ ہو کہ تم اپنی زندگی کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر کے بعض حصّوں میں اسلام کی پیروی کرو اور بعض حصّوں کی پیروی نہ کرو۔

سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے ''اللہ کی رسّی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑ لو، آپس میں پھوٹ نہ ڈالو'' اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں اتحاد و اتفاق کا ثبوت پیش کرتا ہے، سورۂ احزاب میں عورتوں کو پردے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ وہ ستائی نہ جائیں۔ سورۂ الحجرات میں اہل ایمان کو آداب کی تعلیم دی گئی ہے کہ ''آپس میں لڑنا نہیں چاہیے''۔ یہ آیت دنیا کے تمام مسلمانوں کی ایک عالمگیر برداری قائم کرتی ہے، اس کی برکت سے مسلمانوں میں اخوت پائی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں آپؐ کے ارشادات گرامی ہیں: ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا خیر خواہ ہوتا ہے، ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان، مال اور عزت حرام ہے، ایک آدمی کے لیے یہی شر بہت ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے، مومن ایک دوسرے کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے تقویت کا سبب بنتے ہیں۔ جن برائیوں کو ختم کرنے کا حکم ہے ان میں، کسی کا مذاق اڑانا ہے (حرکات و سکنات سے بھی کسی کی دل آزادی نہیں ہونا چاہیے) لعن طعن کرنا، الزام تراشی اور عیب جوئی سے منع کیا گیا ہے۔ کسی کو ایسا لقب نہیں دینا چاہیے جو اس کو ناگوار ہے، جیسے منافق، لنگڑا، اندھا، بہرا۔ ذلیل اوصاف میں شہرت پانے سے بھی روکا گیا ہے۔ کوئی جھوٹ کے لیے مشہور ہو، کوئی وعدہ خلافی کے لیے مشہور ہو، یہ مومن کے لیے شرمناک بات ہے بلکہ ڈوب مرنے کی جگہ ہے۔

گمان سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے کہ زیادہ گمان گناہ ہوتے ہیں۔ گمان کی کئی حیثیتیں ہیں، اپنے گمان کو مطلق العنان نہیں بنانا چاہیے، کسی کے متعلق اپنی بُری رائے پر اصرار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ دل کے بھیدوں کو اللہ ہی بہتر سمجھ سکتا ہے۔ راز کو ٹٹولنے اور عیب کو تلاش کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ یہ شرعاً ممنوع ہے کہ کان لگا کر کسی کی بات سنیں، یا ہمسایوں سے تاک جھانک کریں، دوسروں کی ذاتی زندگی میں دخل دینا بداخلاقی ہے۔ غیبت کو حرام کہا گیا ہے۔ غیبت یہ ہے کہ دوسروں کا ذکر اس طرح کریں کہ اسے ناگوار ہو حتیٰ کہ کسی کی موت کے بعد غیبت نہیں کرنی چاہیے۔ غیبت کو خاموشی سے نہ سنیں بلکہ اس کی حمایت کریں جس کی تذلیل کی جارہی ہے، ورنہ اللہ بھی حمایت نہ کرے گا جب اس کی مدد کی ضرورت ہوگی، غلطی کا جب بھی احساس ہو جائے اس کی تلافی کرنا چاہیے، توبہ کرنا چاہیے، برائی کو بھلائی سے دفع کرنا چاہیے، مسلمانوں کو ان تمام برائیوں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے جو اجتماعی زندگی میں فساد برپا کرتی ہیں، اور جن کی وجہ سے آپس کے تعلقات خراب ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر کرکے انھیں حرام قرار دیا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں بھی چند راہنما اصول بتائے گئے ہیں اور غلط کاموں سے روکا گیا ہے جیسے ماں باپ سے حسن سلوک کرنا، مسکین اور مسافر کو اس کا حق دینا، رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنا، فضول خرچی نہ کرنا، اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشہ سے قتل نہ کرنا، زنا کے قریب نہ پھٹکنا، قتل نفس کا ارتکاب نہ کرنا، مال یتیم کے پاس نہ پھٹکنا، وعدے کی پابندی کرنا، پیمانے ٹھیک تولنا، کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ رہنا جس کا علم نہ ہو، زمین پر اکڑ کر نہ چلنا۔ سورۂ مومنون میں جنت کے وارث کی صفات بیان کی گئی ہیں اور ان مومن بندوں کو فلاح اور کامیابی کی بشارت دی گئی ہے جو نماز میں خشوع وخضوع اختیار کرتے ہیں ، جو لغویات سے دور رہتے ہیں، جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اپنے نفس کو شرک اور کفر سے پاک رکھتے ہیں۔ شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ حرام کاری سے بچتے اور حد سے نہ گزرتے ہوں، امانت اور وعدے کی حفاظت کرنے والے ہوں، فرمایا گیا کہ یہی لوگ جنت الفردوس کے حقیقی وارث ہوں گے۔

سورۂ التغابن میں ارشاد فرمایا ہے کہ مومن کا مال اور اس کے اہل وعیال ایک بڑی آزمائش ہیں کیونکہ زیادہ تر انھیں کی محبت انسان کو ایمان واطاعت سے منحرف کرتی ہے ، اس لیے اہل ایمان کو چوکنا رہنے کی تاکید کی گئی ہے کہ ان کا مال اور اولاد ان کے حق میں راہِ خدا کے رہزن نہ بن جائیں۔ ان کی دنیا بنانے میں اپنی آخرت نہ برباد کرلیں۔ ان کی محبت کو اتنا نہ بڑھالیں کہ وہ اللہ کے تعلق میں حائل ہوجائے۔ ایک حدیث میں آپ نے فرمایا کہ: ''قیامت کے روز ایک شخص کو لایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اس کے بال بچے اس کی ساری نیکیاں کھا گئے۔'' مال اور اولاد کو فتنہ کہا گیا ہے لیکن اولاد کی پرورش اسلامی خطوط پر کی جائے تو یہ اولاد فتنہ کے بجائے متقیوں کے امام بھی بن سکتی ہے، اور اللہ اپنی راہ میں خرچ ہونے والے مال کو اپنے ذمہ قرض بتاتا ہے، اور اسے بڑھا چڑھا کر واپس کرنے اور اوپر سے اجرِ عظیم کا بھی وعدہ فرماتا ہے۔ (تفہیم القرآن، مولانا مودودیؒ)۔

سبحان اللہ ۔ یہ اور ایسی کئی ہدایتیں اور اصول ہیں جو ہمارے درد کا درماں ثابت ہوجائیں گی، اگر ہم نیک نیتی سے اس پر عمل پیرا ہوں۔ اس لیے کہ ''جو ہے راہِ عمل پہ گامزن محبوب فطرت ہے''۔ اللہ ہمیں توفیق دے کہ اس نسخۂ کیمیا کو ہم حرزِ جان بنالیں۔ اپنی زندگی میں شامل کرلیں تاکہ ہم فلاح پاجائیں۔ ہمارا گھر امن وشانتی کا گہوارہ بن جائے، ہمارا خاندان خوشحال خاندان بن جائے اور پھر ''عجب نہیں ہے کہ یہ چارسو بدل جائے''۔

میری زندگی میرا بانکپن میری ہر خوشی کا حساب کیوں
میرے ہم نشیں میرے روز و شب میری دوستی کا حساب کیوں

میری فکر ہے میری سوچ ہے میرا درد ہے میری آرزو
میرے آنسوؤں پہ سوال کیوں میری خاموشی کا حساب کیوں

مجھے کیا پسند ہے ناپسند میری چاہتیں میری خواہشیں
میرا حسن ہے میرا ذوق ہے میری دلبری کا حساب کیوں

میری حسرتیں میرے خواب ہیں میری گفتگو میرا رنج وغم
میرے ہونٹ ہیں میرا جام ہے میری تشنگی کا حساب کیوں

یہ شعورِ حسنِ مزاج ہے میں نظر نظر سے ہوں آشنا
میرا وقت ہے میرا فیصلہ میری ہم سری کا حساب کیوں

میری جستجو میرا ذہن ہے میری وسعتیں میرا سلسلہ
میری رہ گزر میرا حوصلہ میری برتری کا حساب کیوں

کہ خیالِ حرمت عشق ہے، مجھے پتھروں سے گلہ نہیں
میرے زخم ہیں میری سسکیاں میری بے بسی کا حساب کیوں

پروفیسر شاہد ذکاءاللہ

لہو پکارے گا آستین کا

شیخ احمد ضیاء

مرزا نے آج آتے ہی بڑے رازدارانہ لہجہ میں ہم سے کہا میاں! آج ہم نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ اگر تم واقعی سیریس ہو تو میں اس خواب کے بارے میں کچھ سناؤں گا ورنہ نہیں۔ ہم نے کہا مرزا خواب تمہارا۔ نیند تمہاری۔ اس میں ہمیں کیا تکلیف ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے سننے کیلئے دو کان دیئے ہیں۔ ہم اس میں ناشکری کیوں کریں گے۔ ویسے بھی تم روزانہ ایسی کونسی کارآمد باتیں کرتے ہو جو آج اجازت لے کر سنانا چاہ رہے ہو۔ مرزا نے کہا بات کچھ ایسی نہیں۔ یہ خواب بڑا مزیدار ہے۔ ہم نے خواب میں دیکھا کہ ہمیں امن کا نوبل انعام دیا جا رہا ہے اور اس طرح نوازے جانے کی وجہ یہ بتائی جا رہی ہے کہ چونکہ ہم نے ہمارے نائب وزیر اعظم شریمان نریندر مودی جی کی رتھ یاترا میں ان کے ہم سفر بننے کا شرف حاصل کیا ہے اس لئے ہمیں یہ اعزاز دیا جائے گا چونکہ ہمارے اس طرح اس یاترا میں شریک ہونے سے امن عالم کی راہیں ہموار ہوگئی ہیں اور صدیوں تک اس دوستانہ ماحول کے بگڑنے کا کوئی خدشہ نہیں۔ ویسے میاں ایک بات یہ بتاؤ یہ نوبل انعام آخر ہے کیا بلا۔ جو اس کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے۔ ہم نے کہا مرزا 1833ء میں یعنی انیسویں صدی کے وسط میں الفریڈ برن ہارڈ نوبل نامی ایک بچہ سویڈن میں پیدا ہوا اور 1896ء تک اس دنیا کے مزے لوٹتا رہا۔ یہ بچہ کوئی معمولی بچہ نہیں تھا بلکہ اس نے اپنی کم عمری ہی میں ڈائنامائٹ کے موجد ہونے کا شرف حاصل کیا جس کے استعمال سے دنیا کی تباہی ممکن ہو سکی ہے۔ اس شریف انسان نے تباہی کا سامان ایجاد کیا لیکن یہ اندر سے ایک اچھا آدمی تھا اس لئے زندگی بھر پچھتاتا رہا کہ آخر اس نے یہ کیا کر ڈالا۔ تب اس کے ذہن میں ایک بات آئی کہ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اس نے اپنی سوچ کو مثبت رخ دیا اور اپنی تمام دولت سے ایک فنڈ قائم کیا اس ہدایت کے ساتھ کہ اس رقم سے سائنسی تحقیقات کرنے والوں اور انسانیت کی بھلائی و امن قائم کرنے والوں کو ہر سال انعامات سے نوازا جائے۔ آج کل سائنسی میدان اور طبی میدان میں یہ انعام کسے مل رہا ہے اور ان سائنسدانوں کی انسانیت کی بقاء کے لئے کیا خدمات ہیں کوئی نہیں دیکھ رہا ہے البتہ امن کے میدان میں اس انعام کے بڑے چرچے ہیں جسے۔ تم نے اپنے خواب شریف میں دیکھا ہے۔ ویسے مرزا یہ انعام آخر خاص طور پر تمہیں ہی کیوں دیا گیا یہ تشویش کی بات ہے۔ تم واحد شخص تو نہیں جو اس یاترا میں شامل ہوئے۔ اس یاترا کے نقطہ آغاز ہی سے کئی نام نہاد مسلمانوں کے رہنما و ہمدرد اس یاترا کا حصہ بنتے گئے۔ ہمارے کئی وزراء نے بھی اس یاترا کا پرجوش استقبال کیا اور شامل ہوئے۔ ان سب کو چھوڑ کر تمہیں منتخب کرنے کی وجہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

ویسے مرزا تم نے یہ نہیں پڑھا ہوگا کہ اس انعام کے لئے اصل میں جن اہم شخصیتوں کی سفارش کی گئی ہے وہ ہیں امریکہ کے سابق صدر جارج بش اور برطانیہ کے وزیر اعظم ٹونی بلیئر، چونکہ حمص کے سربراہ شیخ احمد یٰسین کی شہادت حال ہی میں ہوئی اور جب تک یہ سفارش کا مرحلہ طئے ہو چکا تھا ورنہ جلاد اعظم ایریل شارون وزیر اعظم اسرائیل کے نام کی بھی سفارش کی جاتی۔ اکثر لوگ پریشان ہیں کہ ان جلادوں کا امن انعام کے لئے سفارش کیا جانا کیا مطلب رکھتا ہے لیکن تم نے اس سفارشی خط کا متن دیکھا ہوا ہے جس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ انہیں کیوں نوبل انعام کا مستحق ٹھہرایا گیا ہے۔ اس سفارشی خط کا متن کچھ اس طرح ہے۔

1۔ امریکہ کے سابق صدر جارج بش اور برطانیہ کے وزیر اعظم ٹونی بلیئر کی مشترکہ کاوشیں قابل قدر ہیں۔ چونکہ ان دونوں نے مل کر ساری دنیا میں ایک دہشت پیدا کردی ہے اور انسانوں کو خدا کی یاد دلا دی ہے۔ ان دونوں نے انسانوں کی آبادی کو قابو میں رکھنے کی بھی اچھی سعی کی ہے ورنہ دنیا کی آبادی مزید بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور لوگ دانے دانے کو محتاج ہو جاتے۔ انہوں نے معصوم عوام کا بے رحمانہ قتل کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا کہ ''بیماری کو ختم کرنے کے بجائے بیماروں کو ختم کردو'' مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

2۔ افغانستان اور عراق پر ان دونوں کی مشترکہ حکمت عملی کامیاب رہی۔ سینکڑوں انسانی جانیں ضائع ہوگئیں۔ اب مسلمان عورتیں ان ملکوں میں بے پردہ گھوم رہی ہیں اور سکون کی سانس لے رہی ہیں جو ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ خواتین بیوٹی پارلر جا رہی ہیں نوجوان ڈسکو میں ناچ رہے ہیں جو واقعی ایک پرامن ملک کی علامت ہے۔

3۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تب یہ دونوں چنگیز خان اور ہٹلر وغیرہ سے بھی زیادہ خطرناک ہیں اور ساری دنیا کے انسانوں پر ان کی دھاک جمی ہوئی ہے۔ ساری دنیا کے لوگ ان کے کارناموں سے سہم رہے ہیں۔ یہ دونوں واقعی امن کی علامت ہیں۔ اس لئے انہیں یہ انعام دے دیا گیا تو ان ممالک کے معصوم شہداء کی روحیں کانپ اٹھیں گی۔ نونہالوں کی فریاد جو وقت سے پہلے یتیم ہوگئے ہیں عرش تک پہنچ جائیں گی۔ ان بیواؤں کے نالے زمین و آسمان ایک کردیں گے جنہوں نے نوجوانی ہی میں سفید لباس پہنا ہم نے کہا مرزا ایسا ہوگا اور واقعی ایسا ہی ہوگا۔ یہ ممکن ہے۔ اس واقعہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی شاعر نے کسی وقت کہا تھا کہ:

''جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا''

مرزا ہمارے اس شاعرانہ جواب کو سن کر خاموش ہوگئے اور خدا حافظ کہہ کر گھر کی جانب چل پڑے۔

ادب اور تحریک اسلامی

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی

ادب، تحریک اور اسلام کے باہمی تعلق اور تقاضوں پر اظہار خیال سے پیشتر ادب کیا ہے؟ فرد و معاشرے اور زندگی سے اُس کا کیا تعلق ہے؟ جیسے سوالوں پر غور کر لینا مناسب ہے۔ ہمارے خیال میں ادب کی کوئی منطقی تعریف نہیں کی جاسکتی، اگر ایک طرف ادب کو وقت اور زمانے کا آئینہ کہا جاسکتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ اسے ہم حُسن کلام اور تاثیر کلام کے نام سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں، دراصل ادب نام ہے احساسات کو لفظوں میں ڈھالنے کا، جذبات کو مترنم پیکر عطا کرنے کا، تصوّرات کو قابل فہم اشاروں میں تبدیل کرنے کا ادب انسانی زندگی کا حسین ترجمان اسکے افکار کا پرتو اور اسکے خیالات کا عکس ہوتا ہے، ادب زندگی سے پیدا ہوتا ہے زندگی کی ترجمانی کرتا ہے اور زندگی ہی کے کام آتا ہے اور ہمیشہ مُعاشرے اور زندگی کی تعمیر یا تخریب میں مشغول رہتا ہے، یہ ناممکن ہے کہ کسی معاشرے کا ادیب اپنے کو معاشرے سے خارج کرکے کوئی اور ہی ادب پیش کرے یا یہ کہ جو کچھ وہ پیش کرے وہ دوسروں پر اثر انداز نہ ہو، وہ ادب ہی نہیں جو معاشرے اور اس میں رہنے والے فرد اور اسکی زندگی کو اپنے مخصوص رنگ سے متاثر نہ کرے۔ مغربی لادینی نظریات اور مختلف مادّی افکار کے حوالے سے ادب نے معاشرے کو جس طرح متاثر کیا ہے اور اسکے نتیجہ میں نئے معاشرے کا انسان جس بحران، انتشار، ناآسودگی، روحانی کرب، اخلاقی انارکی، جنسی بے راہ روی، فحاشی و بے حیائی قتل و غارت گری، معاشی استحصال، معاشرتی نابرابری، منافقت، فریب اور تہذیبی شکست وریخت سے دوچار ہے، آج کے ادب میں انکا اظہار بھی ہوا ہے اور مختلف الحادی اداروں کے ذریعہ انکا فروغ بھی۔ چنانچہ نیا ادب چاہے وہ ترقی پسندی ہو یا جدیدیت، لوگ اسکے پھیلائے ہوئے جراثیم سے مسموم ہوتی ہوئی فضا کو اب محسوس کرنے لگے ہیں اور اس سے نجات کی راہ ڈھونڈھنے لگے ہیں۔ یہی وہ حالات تھے جنھوں نے ادب میں تحریک اسلامی کا شعور پیدا کیا اور اسلامی رجحانات کے فروغ اور نشونما کی منظم کوششیں شروع ہوگئیں۔

ادب کی طاقت کو دنیا کی تمام تحریکات نے تسلیم کیا ہے اور اپنے نظریات کی اشاعت کے لئے اسے بطور وسیلہ استعمال کیا ہے۔ اب ایک ایسی انقلابی تحریک جو زندگی کے ہر پہلو اور ہر ادارے کی اصلاح چاہتی ہے، جو تعلیم، سیاست اور معاشرت کو بدلنا چاہتی ہے، وہ ادب کے شعبے کو کیسے نظرانداز کرسکتی ہے، ہندوپاک کے مشہور ادیب افسانہ نویس اور تحریکی رہنما جناب سید اسعد گیلانی نے ایک جگہ بڑی عمدہ بات لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ’’کوئی تحریک بھی ادب کا تعاون حاصل کئے بغیر جڑ نہیں پکڑسکتی اور کسی تحریک کا کوئی پروگرام بھی بروئے کار نہیں لایا جاسکتا، جب تک ادب اس پروگرام کو اپنی آغوش میں لے کر دل و دماغ میں اسے بیٹھا نہ دے، یہ دونوں چیزیں لازم وملزوم سی ہیں۔ ایک مسافر ہے تو دوسرا زادراہ، ایک سپاہی ہے تو دوسرا اس کا اسلحہ، ایک قافلہ ہے تو دوسرا اس کا پیش رو۔‘‘

ہر تحریک اپنے دامن میں ایک انقلاب کا تصور رکھتی ہے اور ہر انقلاب قلب ونظر کے زاویوں سے لے کر زندگی کے تمام مادی واخلاقی پہلوؤں پر ایسے ہمہ گیر اثرات ڈالتا ہے اور یہ اثرات ادب کے ذریعے غیر محسوس طریقے پر دل کی ایک لرزش سے جو جسد انسانی میں سرایت کرتا رہتا ہے دراصل دل و دماغ اور قلب ونظر کی تبدیلی اور تعمیر جدید میں ادب کسی بھی تحریک کا سب سے بڑا ایجنٹ ہوتا ہے وہ چپکے چپکے آنکھوں کے راستے دلوں میں اترتا ہے یا کانوں کے راستے قلوب میں گھر بناتا ہے اور آنے والے انقلاب کے لئے جذبات اور احساسات کے مورچہ بناتا ہے، یہ ادب ہی ہے جو براہ راست حملہ کرکے شکار کو بھڑکاتا نہیں بلکہ اسکے گرد تصورات وتخیلات کی سوندھی سوندھی فضاء پیدا کرتا ہے شکار خود بخود اس خوشبو کو اپنے دل میں جذب کرنے کے لئے اپنے جسم کے تمام بند ڈھیلے چھوڑ دیتا ہے۔ ادب کی اسی طاقت کا تذکرہ کرتے ہوئے ہندوپاک کے مشہور ادیب شاعر اور مصنف جناب نعیم صدیقی نے لکھا ہے کہ: ’’ادب خیال انگیز اور خیالات افروز قوت ہے وہ معاشرہ کی کھیتی میں خیالات کے بیج ڈالتا ہے اور پھر انکی آبیاری کرتا ہے وہ خیال کے جمود کو توڑتا ہے اور حرکت پیدا کرتا ہے وحی الٰہی کے بعد اگر کوئی دوسرا ذریعہ انسانیت کو خیالات سے مالا مال رکھنے کا ہے تو وہ ادب ہے ادب خیالات کو ابھارتا ہے۔‘‘

واقعہ یہ ہے کہ ادب انسانی خیالات، جذبات اور اقدار کو زندہ رکھنے اور بنانے بگاڑنے والی عظیم طاقت ہے، دنیا کی تمام تحریکات نے اس طاقت کا خوب خوب ادراک بھی کیا ہے اور بہتر سے بہتر استعمال بھی، فرانس کا عوامی انقلاب والٹیر اور روسو کے قلموں کو نہیں بھول سکتا، ان کے قلموں کی سیاہی اس انقلاب کا جیتا جاگتا خون ہے۔ روس کا اشتراکی انقلاب مارکس ٹراٹسکی گورکی اور دوسرے اہل قلم حضرات کے قلموں کی جنبش پر چلتا ہوا نظر آتا ہے جرمنی کا نازی انقلاب، اس تصور سے اُبھرا ہے، جو نٹشے نے اپنی تحریروں میں چھوڑا تھا، اسی طرح خود انبیائی تاریخ پر اگر آپ ایک نگاہ ڈالیں تو دیکھیں گے کہ انبیاء علیہم السلام نے اپنے اپنے دور میں جو تحریکیں چلائیں، ان میں خدا کے لکھائے

ہوئے اسالیب بیان کو اپنی دعوت کے فروغ کے لئے پورے طور پر استعمال کیا۔ خدا کا کوئی پیغمبر ایسا نہ تھا جو ادب کے بارے میں معمولی ذوق کا مالک ہو، آج بھی الہامی کتابوں کے ذخیرے میں پورا پورا ادبی زور موجود ہے، حضرت عیسیٰؑ کی دعوت کے انجیل میں جو ٹکڑے ملتے ہیں، ان کی قدر و قیمت دوامی ہے یہی حال زبور کا ہے، اگر چہ ان میں تحریف ہوچکی ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ ان میں ادب کا پورا پورا اہتمام ہے، قرآن مجید اس سلسلے میں اخری چیز ہے جسے ادبی چیلنج کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، عرب میں اسلام کی انقلابی تحریک جب اُٹھی، جاہلی ادب کے مقابلے میں قرآن کی ادبیت کو استعمال کرنا پڑا اور جب جاہلی ادب کو قرآنی ادب نے چیلینج کیا تو عرب کے کسی بڑے سے بڑے ادیب کو اس کے مقابلے کی ہمت نہ ہوسکی کہ اسکی عظمت کے سامنے اپنا چراغ جلا سکے۔

ادب کی طاقت کو تمام آسمانی کتابوں میں استعمال کیا گیا ہے بلکہ یہ تقاضہ کیا گیا ہے کہ اس کے علمبردار ادب کی طاقت کو معرکہ خیر وشر میں استعمال کریں خود مدینہ منوّرہ میں جب اسلامی مملکت کا قیام عمل میں آیا اور بزم رسالت سجائی گئی تو پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰؐ نے ارشاد فرمایا ''جنھوں نے خدا اور رسول کی مدد تلواروں سے کی ہے آخر وہ شعر و ادب سے اس مقصد خاص کی اشاعت کیوں نہیں کرتے، یہ سنتے ہی حضرت حسّان بن ثابتؓ جو اپنے زمانے کے جلیل القدر شاعر تھے، اُٹھے اور عرض کیا ''میں اس خدمت کے لئے حاضر ہوں۔'' چنانچہ اس دور میں جب حق و باطل کی قوتیں نبرد آزما تھیں، اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مخالفین کا سرنیچا کرنے کیلئے فن ہجوگوئی سے بھی کام لیا جائے، عرب میں یہ صنف بہت زیادہ مقبول اور موثر تھی اس وجہ سے مشرکین قریش کی ہجوئیں شعرائے اسلام نے لکھیں، حضرت حسان بن ثابت اس فن میں زیادہ دستگاہ رکھتے تھے رسول اکرمؐ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ ''حسان کے اشعار مخالفین اسلام پر تیر سے کہیں زیادہ ضرب کاری لگاتے ہیں'' حضرت حسّان بن ثابتؓ، کعب بن زبیرؓ اور نابغتہ الجعدی وغیرہ نے اپنے شعر و ادب سے اس عہد کی تحریکی ضرورتوں کو خوب خوب پورا کیا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ اسلامی تحریک جو دنیا کی تحریکوں میں سب سے زیادہ انسان کی فطرت کے قریب ہے۔ وہ کبھی بھی ادب کی خدمت سے محرومی کی حماقت نہیں کرسکتی چنانچہ اب آخر میں تحریک ادب اسلامی کی ضرورت واہمیت کے سلسلے میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ایک تقریر کا آخری اقتباس پیش خدمت ہے، جو انھوں نے حلقہ ادب اسلامی پاکستان کے اجلاس مورخہ ۳۱؍جولائی ۱۹۵۰ء میں کی تھی، یہ پوری تقریر وابستگانِ تحریکِ اسلامی کے لئے ایک واضح نشانِ راہ ہے، مولانا مرحوم فرماتے ہیں: ''ہر شخص کو اپنے آپ کو ٹٹول کر دیکھنا چاہئے جو ادب کے جس شعبے کیلئے موزوں ہے وہ اپنے آپ کو اسی کے لئے تیار کریں، جو خطابت کی صلاحیت پاتے ہوں، وہ اپنے آپ کو اسی کے لئے تیار کریں تا کہ ان کی یہ قوت ناطقہ اور قوت کلام خدا کے کام میں آئے، جن کے اندر لکھنے کی صلاحیّت ہو تو اپنا جائزہ لیں کہ وہ کس نوعیت کے کام کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ صحافت، شاعری، افسانہ نویسی جس چیز کے لئے اپنے آپ کو موزوں پائیں اسی کے لئے نفس کی تربیت کریں اور جو لوگ بہتر علمی اور دماغی صلاحیّت رکھتے ہوں، وہ علم کے مختلف شعبوں میں آگے قدم بڑھائیں۔''

ہم ایک بڑے طوفانی دور سے گذر رہے ہیں اس وقت دنیا میں دو نظریوں کی کشمکش جاری ہے اور وہ ساری دنیا کو اپنے لپیٹ میں لے رہی ہے ہم ان کے درمیان تیسرے نظریے والے ہیں، ہمیں کوشش کرنی ہے کہ اپنی ساری قوتوں سے اپنے نظریۂ حق کو کامیاب بنائیں، جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کی ہیں۔ قوت ناطقہ اور قوت فکر و فہم سب سے زیادہ ضروری ہے جسمانی طاقتیں بھی ان طاقتوں سے علیحدہ استعمال نہ کی جائیں گی۔ میں خاص طور پر اپنے نوجوانوں کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ اس جمود کو ختم کریں اور ادب کے ہر شعبے میں آگے بڑھیں مجھے توقع ہے کہ میری یہ اپیل بہرے کانوں سے نہ سنی جائے گی اور رفتہ رفتہ ادب کے محاذ کی طرف ہمارے نوجوان کثرت سے متوجہ ہوجائیں گے۔''

مولانا مودودیؒ کا یہ فکر انگیز بیان نہ صرف موجودہ حالات میں شعر و ادب کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے بلکہ اس حقیقت کا اظہار بھی کہ اگر ہم اب بھی اس طرف متوجہ نہ ہوں گے تو ابلاغ عامّہ کے جدید وسائل ریڈیو، ٹیلیوژن اور اخبارات ورسائل پر باطل پرستوں کا نہ صرف قبضہ برقرار رہے گا بلکہ وہ اپنے ڈراموں، نغموں حتیٰ کہ خبروں اور ان پر تبصروں کے ذریعہ اسلام دشمنی، الحاد و بے دینی اور عریانی و فحاشی کے فروغ میں کوشاں رہیں گے اور ہم انکا کوئی توڑ نہ کرسکیں گے۔ لہٰذا اب بھی موقع ہے کہ ہم اپنے ادبی محاذ کی اہمیت سمجھیں اور نہ صرف اُسے اپنا ہر طرح کا تعاون پیش کریں بلکہ ہمارے اہل فکر و فن نوجوان اس میدان علم دانش میں قدم رکھیں اور تمام اصنافِ ادب میں اسلامی اقدار کے فروغ کے لئے نئی نئی راہیں تلاش کریں۔

تحریک ادب اسلامی سے وابستہ قلمکاروں کو ایک بار پھر اپنے عہد کے ادبی و تحریکی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے برسر پیکار ہونا ہے، انھیں اُسی خلوص، جذبے اور نیّت سے قلم اُٹھانا ہے، جس نیت سے وہ مسجد میں نماز کے لئے یا میدان میں جہاد کے لئے داخل ہوتے ہیں، کیونکہ ان کا ادب عبادت کے لئے وقف ہے، لیکن اسی کے ساتھ دوسری اہم چیز فن ہے۔ ادب میں فن کی کمزوری خلوص نیّت اور جذبہ نمود سے بے نیازی کا بدل نہیں بن سکتیں، ہماری فنّی کوتاہیاں، مقصد و نصب العین کی خدمت کے بجائے اس کا وزن کم کرنے کا موجب ہوسکتی ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کن کن الفاظ کا استعمال کس کس جگہ مفید ہے، جس سے ہم اپنا راستہ نکال سکیں۔ الفاظ ادیب کے لئے آلات کار ہیں، ان آلات کا مناسب اور برمحل استعمال ہی ایک سپاہی کو میدان جنگ میں کامران کرتا ہے، لہٰذا موجودہ معاشرے کو رائج الوقت الحادی ادب کے پنجے سے نکال کر اپنے تحت لانے کے لئے ہمیں شدید محنت اور فنّی ریاض کرنا ہوگی، اس سلسلہ کی دوسری اہم ترین چیز مطالعہ کی وسعت ہے موجودہ ادب اور اس کے سرچشمے کو اچھی طرح جانے بغیر ان پر غلبہ حاصل نہیں ہوسکتا، اس کے لئے ماضی و حال کے تمام ادب مختلف مادّی افکار ونظریات اور عقائد و مذاہب کا تنقیدی و تقابلی مطالعہ ضروری ہے، اس سے فن میں گہرائی و گیرائی پیدا ہوتی ہے، ادبی رسوخ بڑھتا ہے تخلیق کو عمر دوام نصیب ہوتی ہے۔

تیسری چیز جو ہمیشہ دل و دماغ میں تازہ رکھنے کی ہے، وہ یہ کہ ہمیں بہرحال ایک نصب العین کی خدمت کرنی ہے اور ایک مقصد کو فروغ دینا ہے۔ چنانچہ ہماری کوئی چیز میدان ادب میں آئی جو اس نصب العین کو تقویت کے بجائے اسکی تذلیل اور سبکی کا باعث ہوئی تو یہ خود اس نصب العین کو نقصان پہنچانے کا باعث ہوگا۔ لہٰذا یہ کوشش بھی ہونی چاہئے کہ ہمارے ادبی محاذ پر کوئی ایسی چیز نہ آنے پائے جو اجتماعی نصب العین کو نقصان پہنچانے والی ہو۔ آخری بات یہ ہے کہ ادب میں الحاد و بے دینی کے غلبہ اور فحاشی و بے حیائی کے سیلاب کو روکنے کے لئے منظّم جدّ و جہد کا عزم اسلامی فنکاروں کا فرض ہے، ہمارا کام یہ ہے کہ اس محاذ پر اپنی قوتوں کو رتی رتی جمع کردیں۔ جس محاذ پر جاہلیت کے کارندوں نے جاہلی ادب کے پہاڑ کھڑے کر رکھے ہیں، وہاں ہم حقائق کے سنگریزوں کو لا کر ڈال دیں اور اس طرح اپنی اجتماعی کوششوں کے ذریعہ ایک ایسی تحریک کا آغاز کریں جس سے ادبی جاہلیت کا غلبہ ختم ہوا اور انسانی فطرت کے صحیح رجحانات کی حفاظت ہو۔

سننا ہنر

بولنا ایک فن ہے لیکن سننا اس سے بھی بڑا فن ہے۔ جس کے لیے اچھی خاصی مہارت درکار ہوتی ہے۔ مگر اب یہ فن تیزی سے دم توڑ رہا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ جو کہے اسے توجہ کے ساتھ سنا جائے اور اس کی بات کو معتبر سمجھا جائے۔ اسے گفتگو کے دوران ٹوکا نہ جائے۔ اس کے سنائے ہوئے لطیفے پر ہنسا جائے اور اس کی بتائی ہوئی سنجیدہ بات کو سنجیدگی سے سنا اور اس پر مناسب ردعمل کیا جائے، مگر عام طور پر ہم ایسا نہیں کرتے۔

فعال ہو کر سننا سماعت کا ایک ایسا طریقہ ہے جو لوگوں کو اپنے مسائل کے بارے میں بات چیت کرنے میں مدد کرتا ہے چاہے ان کے لیے انہیں الفاظ میں بیان کرنا کتنا ہی مشکل ہو۔

اکثر ایسا ہوتا کہ ہم گفتگو کے دوران ایسی بات کہتے ہیں جو گفتگو کو روک دیتی ہے اور اس سے سامنے والے کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور وہ اپنی بات کو مکمل نہیں کر پاتا، بسا اوقات ایسا سامع میں مطالعہ کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے، جو شخص مطالعہ نہیں کرتا اس میں دوسروں کی بات اچھی طرح سننے کی صلاحیت بھی پیدا نہیں ہو سکتی کیونکہ دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ مطالعہ بھی سننے، سمجھنے اور نتیجہ اخذ کرنے کی اہلیت میں اضافہ کرتا ہے۔ مطالعہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ دنیا، سماج اور لوگوں کے بارے میں دوسروں کے نقطہ نظر، تہذیب و سیاست اور مذاہب کے بارے میں ان کے خیالات، زندگی سے متعلق دوسروں کے نظریات اور سب سے بڑھ کر ان کے تجربات کو تحمل مزاجی سے کیسے سننا ہے۔

سننا ایک دیرپا فن ہے یہ ایسی صلاحیت ہے جو زندگی کے ابتدائی حصے میں ہی حاصل ہو جانی چاہیے۔ یہ ایک ایسی اہلیت ہے جسے ہم کو اپنی زندگی میں تواتر سے کام لینا چاہیے۔

اچھا بولنے کے لئے اچھا سننا ضروری ہے۔ ہمیں دوسروں کی بات سننے اور سمجھنے کی عادت ڈالنی چاہیے کیوں کہ عقلمند انسان کی پہچان یہی ہے کہ وہ کم بولتا اور زیادہ سنتا ہے۔

عبدالمنعم ناصح

اوٹّال (ملیالم فلم)

اوٹّال Oottaal روسی ادیب اینٹان چیکوف Anton Chekov کی لکھی گئی مختصر کہانی پر مبنی، ملیالم زبان میں بنائی گئی ایک بہترین فلم ہے۔ فلم کی کہانی دو مرکزی کرداروں کے گرد گھومتی ہے، جس میں ایک واسودیون، جو ایک ۷۰ سالہ بوڑھا شخص ہے اور بطخ پالن کا کام کرتا ہے، اور دوسرا کٹّپائی، جو ایک ۸ سالہ لڑکا اور واسودیون کا نواسا ہے، جس کے ماں باپ بینک کا قرض ادا نہ کرنے کے باعث خودکشی کر چکے ہیں۔ کہانی کا زیادہ تر حصہ نانا اور نواسے کے رشتے اور ان کی روزمرہ کی زندگی کے واقعات پر مبنی ہے، لیکن بظاہر عام سے نظر آنے والے واقعات میں، زندگی کی اہم حقیقتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ کٹّپائی، ایک انتہائی ذہین، مگر مواقع اور وسائل سے محروم لڑکا ہے، جو صرف دو جماعتوں تک تعلیم حاصل کر سکا، مگر جس طرح وہ اپنے ایک امیر دوست ٹنکو کی اسکول کے کاموں میں مدد کرتا ہے، اس کی کشادہ دلی کو پیش کرتا ہے، وہیں ٹنکو کے والد کی کٹّپائی کے متعلق تنگ نظری کو بھی بتایا گیا ہے۔ گاؤں کی اور بالخصوص، غریب مزدور پیشہ افراد کی سادہ زندگیوں کو انتہائی خوبصورتی سے فلمایا گیا ہے۔ آگے چل کر واسودیون کو اپنی مہلک بیماری کا علم ہونے پر کٹّپائی کی پرورش کی فکر ہوتی ہے، اور ساتھ ہی اس سے جدائی کا غم بھی۔ اس دوران فلم کا ایک منظر بہت متاثر کرتا ہے جس میں، بطخوں کے انڈوں کو مرغی کے ذریعے سینکے جانے پر جب اس میں سے بچے باہر آتے ہیں تو واسودیون مرغی کو دور پھینک دیتا ہے، کٹّپائی کے دریافت کرنے پر وہ بتاتا ہے کہ مرغی جب بطخ کے بچوں کو دیکھے گی تو انہیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ پھر کٹّپائی کے سوال پر کہ ''ان بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟'' واسودیون نم آنکھوں سے کہتا ہے ''خدا، ان کی دیکھ بھال کرتا ہے''۔ آخر میں واسودیون اپنے مالک کے ذریعے کٹّپائی کو ایک یتیموں کے اسکول بھیجنے کا انتظام کرتا ہے، مگر اس کا مالک فریب دہی کرتے ہوئے اسے ایک فیکٹری مالک کے ہاتھوں بغرض مزدوری فروخت کر دیتا ہے، اور کٹّپائی کسی طرح اپنے حالات، ایک خط کے ذریعے اپنے نانا کو لکھتا ہے اور فلم اپنے اختتام کو پہنچتی ہے، جو بچہ مزدوری کے خلاف ایک متاثر کن پیغام دے جاتی ہے اور ساتھ ہی تعلیم کو ایک بہتر سماج کے لئے امید کی حیثیت میں پیش کرتی ہے۔

ابورجاء

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

(جن کی زندگی میں طالب علموں کیلئے بڑا سبق ہے۔)

زکریا خان

امام شافعیؒ کا نام محمد بن ادریس الشافعی تھا، آپ ۱۵۰ھ (اگست ۷۶۱ء) میں غزہ، موجودہ فلسطین میں پیدا ہوئے۔ سن ۱۵۰ھ یہ وہی سال ہے جس میں امام اعظم ابو حنیفہؒ نے وفات پائی تھی۔ شافعی آپ کے آباؤ اجداد میں ایک صحابی گذرے ہیں اسی نسبت سے آپ کو شافعی کہا جاتا ہے۔ دو سال کی عمر میں آپ کی والدہ ماجدہ آپ کو مکہ لے آئیں اور یہیں سے آپ نے تحصیل علم کا آغاز کیا۔ اسلامی تاریخ میں چار بڑے امام گزرے ہیں امام اعظم ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام شافعیؒ۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی مسلمان پائے جاتے ہیں ان میں کی اکثریت ان چار اماموں میں سے کسی ایک امام کے مسلک کی پیروی کرتی ہے۔ اس خاکے میں ہم کچھ اہم باتیں امام شافعیؒ کی زندگی کے متعلق دیکھیں گے۔

امام شافعیؒ کی ابتدائی زندگی میں نوجوان طالب علموں کیلئے بڑا سبق ہے۔ امام شافعیؒ کی پیدائش سے قبل امام کے والد انتقال کر گئے تھے یعنی آپ یتیم پیدا ہوئے۔ یعنی باپ کی وہ ہستی جو سراپا شفقت و محبت ہوتی ہے امام اس نعمت ہی سے محروم تھے۔ آپ نسلاً قریشی تھے اور فطری طور پر حصولِ علم کی شدید خواہش اپنے اندر رکھتے تھے۔ آپ نہایت قوی حافظہ کے مالک تھے آپ نے صرف ۷ برس کی عمر میں پورا قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ تعلیم کے ابتدائی دنوں میں مکہ میں جب آپ محدثین (علمِ حدیث کے ماہر) اور فقہا (علمِ فقہ کے ماہر) سے حدیث و فقہ کا درس لیتے تھے اس دوران آپ کو معاشی تنگی اور بہت سی پریشانیوں سے گزرنا پڑا چونکہ آپ کے والد آپ کی پیدائش سے قبل ہی انتقال کر گئے تھے اور آپ کی کفالت کی ذمہ داری آپ کی والدہ پر تھی۔ لہٰذا امام کو اپنے طالب علمانہ دور میں نہایت غربت کا سامنا کرنا پڑا۔ مکہ میں درس کی کلاسیس میں آپ اکثر احادیث کو یاد کر لیا کرتے تھے اور جب کوئی اہم نکتہ کو لکھنا ہوتا تو اس کیلئے آپ سارے مکہ سے ہڈیاں، کھجور کے پتے اور کچھ ایسی چیزیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے جس پر تحریر ممکن ہو کیونکہ آپ کے پاس اتنی رقم نہیں ہوتی کہ آپ لکھنے کیلئے کاغذ خرید سکیں اور اسی طرح آپ ساری زندگی غربت و یتیمی کے باوجود بھی علم حاصل کرتے رہے۔ امام کی زندگی کا یہ نکتہ نہایت قابلِ توجہ ہے۔ زمانہ حال میں ہم دیکھیں تو یہ چیزیں ہمیں صاف نظر آئے گی کہ وہ طالب علم جن کے ساتھ کچھ معاشی مسائل ہو تو وہ اپنی پڑھائی چھوڑ کر تلاشِ معاش میں لگ جاتے ہیں لیکن امام کی زندگی سے جو سبق ہمیں ملتا ہے وہ یہ کہ کوئی طالب علم بھی جو حصولِ علم کی شدید خواہش اپنے اندر رکھتا ہو، اس میں صلاحیتیں ہوں اور اُس کیلئے وہ خوب محنت کرنے کا عادی ہو تو کوئی پریشانی اور مصیبت بھی خصوصاً غربت اس کے علم کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ بچپن میں امامؒ دو چیزوں سے خصوصاً دلچسپی لیا کرتے تھے ایک تیراندازی اور دوسری چیز تحصیلِ علم۔ امام شافعیؒ خود اپنے متعلق کہتے ہیں ''بچپن میں میری توجہ صرف دو باتوں کی طرف ہی تھی، تیراندازی اور تحصیلِ علم، تیراندازی میں مجھے اتنی مہارت ہوگئی تھی کہ دس میں سے دس نشانے صحیح بیٹھتے تھے'' دراصل تیراندازی ایک دلچسپ اور بامشقت کھیل ہے اس میں مہارت کیلئے جسمانی مضبوطی، اور ذہنی توجہ، یکسوئی اور مسلسل مشق کی ضرورت ہوتی ہے اس سے انسانی شخصیت کو قابلِ قدر فائدہ پہنچتا ہے۔ ایسے بامشقت کھیل میں جو نوجوان ماہر ہوتے ہیں وہ بہت ہی متحرک، تیز اور ان کی زندگی میں ایک نظم وضبط ہوتا ہے وہ سست اور کاہل کبھی نہیں ہوتے اپنے کاموں کو مستعدی کے ساتھ وقت پر انجام دینا ان کیلئے بہت آسان ہوتا ہے۔ اگر ہم نظر دوڑائیں کہ امام کی بچپن و نوجوانی کی یہ بہترین عادات دورِ حاضر کے طالبِ علم اور نوجوانوں میں بالکل نہیں کے برابر نظر آئے گی۔ کچھ طالب علم جو پڑھائی میں دلچسپی تو لیتے ہیں لیکن ایسے بامشقت کھیلوں سے دور ہی رہتے ہیں اور جو ایسے کھیلوں میں مہارت رکھتے ہیں انھیں حصولِ علم سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ دراصل یہ دونوں ہی رویے غلط ہیں ایک اچھے مستقبل کیلئے عام طور پر ان دونوں چیزوں کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ امام شافعیؒ مکے کے مختلف محدثین وفقہا سے علم حاصل کرتے رہے اور مشہور ہے کہ مکہ کے ایک بڑے عالمِ دین نے آپ کو صرف ۱۵ ربرس ہی کی عمر میں فتویٰ دینے کی اجازت دے دی تھی۔ اسی اثناء میں ایک معزز فرد نے امام شافعیؒ کو مشورہ دیا کہ آپ مدینہ جا کر امام مالکؒ سے علم حاصل کریں۔ امام شافعیؒ نے اس بات کو قبول کیا اور فیصلہ کر لیا کہ وہ مکہ جا کر امام مالکؒ سے علم حاصل کریں گے۔ پھر آپ نے صرف نو راتوں میں کتاب ''موطائ'' پوری کی پوری حفظ کر لی۔ ''موطائ'' یہ امام مالکؒ کی ترتیب دی ہوئی حدیث کی بہت مشہور کتاب ہے۔ جس میں امام مالک نے بہت سی صحیح احادیث کو جمع کر کے تحریر کیا ہے۔ اب امام نے علم کی خاطر مکہ سے مدینہ کا سفر کیا اور امام مالکؒ کی درس گاہ میں شامل ہوگئے۔ امام مالکؒ مدینہ میں مسجدِ نبوی کے صحن میں درس دیا کرتے تھے اور طالبِ علم بڑی سنجیدگی و وقار سے علمِ دین سیکھتے تھے۔ امام شافعیؒ مسلسل ۸ سال تک امام مالکؒ سے حدیث وفقہ کا علم حاصل کرتے رہے اور اس وقت مدینہ چھوڑ آئے جب امام مالکؒ انتقال کر گئے۔ امام مالکؒ امام شافعیؒ سے بہت محبت کرتے تھے اور ان میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے امام شافعیؒ امام مالکؒ کی درس گاہ میں سب سے زیادہ ذہین اور قوی حافظہ کے مالک مانے جاتے تھے۔ امام مالک کی صحبت میں آپ نے حدیث وفقہ کے علم میں کمال درجہ تک مہارت حاصل کر لی تھی۔ امام مالکؒ کے انتقال کے بعد آپ مکہ لوٹ آئے۔ آپ کے علم اور ذہانت کے نتیجے میں آپ کی لوگوں میں حد درجہ شہرت ہوگئی۔ اسی زمانے میں حج کے دنوں میں امیرِ یمن مکہ آیا ہوا تھا اس کی ملاقات جب امام شافعیؒ سے ہوئی تو امیرِ یمن امامؒ کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر انہیں یمن چلے آنے کی دعوت دی اور کہا کہ آپ وہاں سرکاری خدمات انجام دیں۔ لہٰذا امام نے یمن کا سفر کیا اور وہاں دو سال تک مسلسل سرکاری خدمات انجام دیں۔ امام نے اپنی ذمہ داری کو اس خوبی و مہارت سے ادا کیا کہ جب کوئی مسافر بھی یمن سے مکہ کی طرف آتا تو امام شافعیؒ کی خدمات اور ان کی صلاحیتوں کی تعریف کئے بغیر نہ رہتا اور اسی طرح آپ کے علم و قابلیت کی شہرت دور دور تک ہوگئی۔ ان دو سالوں بعد آپ نے مکہ واپسی کی اور کچھ عرصے بعد بغداد کا سفر کیا۔ (جاری)

درسی کتابوں میں زہریلا مواد شامل کیا جارہا ہے

نئی دہلی، وطنِ عزیز ہندوستان کے اسکولوں میں جو درسی کتب نونہالانِ ملک وملت کو پڑھاتی جاتی ہیں، اس میں تجدید اور ترتیب نو کے نام پر ایسا زہریلا مواد شامل کیا جارہا ہے، جو معصوم بچوں اور بچیوں کے اذہان کو مسموم کرنے کے لیے کافی ہے۔ CERT (سینٹر فار ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ) کی جانب سے کرائے گئے سروے سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ درسی کتب کے ذریعے طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کا ذہن ایک مخصوص طبقہ کے خلاف بڑی مہارت سے تیار کیا جارہا ہے۔ سی ای آر ٹی کے زیرِ اہتمام ہندوستان کے چار صوبوں (راجستھان، مدھیہ پردیش، گجرات اور کرناٹک) کی نئی درسی کتابوں کا سروے کیا گیا اور ان کے اندر قابل اعتراض نکات کی نشاندہی کی گئی۔

پریس کلب آف انڈیا میں ''یوا وچاروں کا وشکرن'' نامی کتاب کا اجرا کیا گیا۔ اس موقع پر صدرِ تنظیم ایس آئی او برادر نحاس مالا صاحب، صحافی انل چمڑیا، سی ای آر ٹی کے سربراہ برادر توصیف احمد اور برادر اظہر الدین (سکریٹری ایس آئی او) نے اخباری نمائندوں سے بات چیت کی۔

اس موقع پر صدرِ تنظیم برادر نحاس مالا نے کہا کہ ''ہمارے ملک میں قومی سطح پر این سی ای آر ٹی اور صوبائی سطح پر متعدد خود مختار ادارے موجود ہیں۔ ہر پانچ سالوں میں منظم طور پر ان تبدیلیوں اور موجودہ نصاب و درسی کتب کے تجزیہ کا ایک باقاعدہ اصول ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ عمل کیسے ہوگا؟ اور کن بنیادوں پر ہوگا؟ سماج اور طلبہ پر اس کے کیا مثبت اور منفی اثرات پڑیں گے؟ اس عمل میں کس حد تک سیاست کا عمل دخل ہوگا اور کیوں؟''

انھوں نے مزید بتایا کہ ''ایسے ہی کچھ سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے لیے سی ای آر ٹی کے زیر اہتمام ملک کے چار صوبوں کی نئی درسی کتب کا سروے کیا گیا جو کہ قومی نصاب کی آؤٹ لائن ۲۰۰۵ (National Curriculum Frame Work 2005) کی بنیادوں پر منحصر ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ لیکن جب ہم نے اس موضوع سے متعلق حاصل کردہ نتائج کو سمجھنا چاہا تو یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد اور بے سروپا سا نظر آیا۔ ان سبھی صوبوں کے نصاب میں کہیں نہ کہیں ایسے موضوعات شامل ہیں جو این سی ایف کے ذریعہ جاری کردہ ہدایات کے پابند نہیں ہیں اور خاص طور پر ایک نظریہ کو پروان چڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔''

اس موقع پر صحافیوں کو تفصیلات بتاتے ہوئے پریس کانفرنس کے شرکاء نے بتایا کہ ''راجستھان کے کورس میں شامل درجہ پنجم کی درسی کتب میں جگہ جگہ ایسی خلاف ورزیاں نظر آتی ہیں۔ کہیں بچوں کو سوریہ نمسکار کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے، کہیں پیڑوں کی پوجا کا ذکر کیا گیا ہے تو کہیں عظیم شخصیات کے نام پر ایک مخصوص نظریہ کے ماننے والوں کو بڑھاوا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح صوبہ گجرات کی درسی کتب میں حکمرانوں کو ایک مخصوص مذہبی رنگ میں رنگنے اور ایک خاص مذہب کے خلاف ماحول تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو کہ این سی ایف کی ہدایات کے بالکل خلاف ہے۔''

مدھیہ پردیش کی درسی کتابوں کا تجزیہ کرنے پر بھی کچھ ایسی ہی چیزیں سامنے آئیں۔ درجہ ششم میں پڑھائی جانے والی سماجی علوم کی کتاب میں بھی ایک خاص مذہب کو بڑھاوا دینے اور اسلام کا تشخص ایک غیر ملکی حملہ آور کے طور پر پیش کرنے کی دانستہ کوشش کی گئی ہے۔ درجہ ہفتم کی درسی کتب میں مغلوں کو مال و دولت کے حریص کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح مذہبی دہشت گردی کو بھی موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ کرناٹک کی سوشل سائنس کی کتاب بالقصد ان ترقی پسند تنظیموں کے خلاف تیار کی گئی ہے جو درسی کتب کے زعفرانی رنگ میں رنگے جانے کے خلاف کمربستہ رہتی ہیں۔

ادبی اشاعت
جلد آرہا ہے۔۔